بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اگست 2020ء

جلد 73 شمارہ نمبر 08

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: یاد اس کی آئی غم تازہ ہوا	ادارہ	4
اَلدِّیْنُ یُسْرٌ	شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی	12
قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں، (آخری قسط)	غلام احمد پرویزؒ	20
عیدالضحیٰ	غلام احمد پرویزؒ	31
میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟	شمیم انور	35
انسانی ذات کی تخلیق اور اس کے مقصد کے فہم کی تلاش	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	40
تقویٰ کا دینی مفہوم	خواجہ ازہر عباس (کراچی)	46
بچوں کا صفحہ: ہم مسلمان کیوں ہیں؟	عارف کسانہ	54

ENGLISH SECTION

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 3 — 56
By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No.2

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: BPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے، مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر 25-B گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یاد اس کی آئی غم تازہ ہوا
(14 اگست کی یاد میں!)

گردشِ لیل و نہار کے حسابی اور میکانکی نظام کی رُو سے' چند دنوں کے بعد' ایک بار پھر 14 اگست سامنے آنے والی ہے۔ تغیراتِ احوال کی ستم ظریفی بھی عجیب حیرت فروش ہوتی ہے۔ واقعہ وہی ہوتا ہے لیکن اس کے تاثرات یکسر بدل جاتے ہیں۔ کبھی اس تقریب کی آمد آمد سے کیفیت یہ ہو جایا کرتی تھی کہ:

پھر نظر میں پھول مہکے' دل میں پھر شمعیں جلیں　　پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور اب یہ عالم ہے کہ:

یاد اس کی آئی' غم تازہ ہوا　　غم کسے کہتے ہیں؟ اندازہ ہوا

قوموں کی تاریخ میں اس قسم کے تغیرات کہیں صدیوں میں جا کر نمودار ہوتے ہیں' لیکن یہ شاید اس ''اٹامک ایج'' کا اثر ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم عیدِ آزادی کا جشن منایا کرتے تھے' اور آج یہ حالت ہے کہ اس تقریب پر ہر قلبِ حساس پکار اٹھتا ہے کہ:

یہ لٹی لٹی سی بہار کیوں ہے' کہاں وہ جانِ بہار ہے؟　　یہ چمن سے کون چلا گیا' کہ کلی کلی کو فشار ہے!

لیکن اس سوگواریٔ بہار کے باوجود' طلوعِ اسلام اپنی اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کر سکتا کہ ان بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتا رہے۔

☆☆☆

تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ہمنوا' بار بار قائداعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصولِ آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی' تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر' انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائداعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں' لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے' وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے

کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کرلیں لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم و مقصود اس سے مختلف ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہوجائے۔ (بالفاظِ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک ''آزاد مملکت'' کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک' آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا منتہیٰ ہے اور یہ منتہیٰ تھا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی۔ یہی وہ نقطہ تھا جو درحقیقت مابہ النزاع تھا۔ ساری جنگ اسی محور کے..... گرد لڑی گئی تھی اور اس میں فریقِ مقابل تھا نیشنلسٹ علماء کا گروہ۔ قائداعظمؒ کا دستِ ہُنر' ہندو کی شاطرانہ عیاری کا نقاب بڑی آسانی سے الٹ دیتا تھا۔ ان کا حسنِ استدلال' انگریز کے اعتراضات کا بھی بڑا مسکت جواب دیتا تھا لیکن علماء حضرات' طرح طرح کی مغالطہ آفرینیوں سے' عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ اقبالؒ عوامی سطح پر جذبات کی لڑائی لڑنا جانتے تھے' نہ قائداعظمؒ۔ اس زمانے میں' عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے خلاف کہہ دیا جاتا کہ وہ ''انگریز نواز'' ہے تو عوام ''ٹوڈی بچہ' ہائے ہائے'' سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ انہوں نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں اور تحریکِ پاکستان انگریز کی سازش کی تخلیق ہے۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے:

> جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں اُترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں' بلاشک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پاسکتیں۔
>
> (پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام' ص 76)

حتیٰ کہ انہوں نے حضرت علامہؒ کا نام لے کر کہا:

> غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار' عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالیٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اسی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنادیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔
>
> (ایضاً' ص 74)

جب انہوں نے ''مسئلہ قومیت'' کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی بحث میں اسی الزام کو دہرایا' تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا تھا:

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہوجائیں بلکہ اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں

انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے' تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا' بولنا' روپیہ صرف کرنا' لاٹھیاں کھانا' جیل جانا' گولی کا نشانہ بننا' سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔ (معرکۂ دین و وطن)

یہ الزامات ویسے ہی بڑے پوچ تھے۔ پھر واقعات ان کی اس طرح تردید کرتے گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غیر مؤثر ہو گئے۔ اس کے بعد' ان حضرات نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کہا کہ مطالبۂ پاکستان کے حق میں جو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس مملکت میں مسلمان' اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے' تو یہ دلیل بڑی بودی اور مغالطہ آفریں ہے۔ آزاد ہندوستان میں' مسلمانوں کے لئے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ انہیں اعتقادات کی پوری پوری آزادی ہوگی۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ جیسے احکام و فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ انہیں شخصی قوانین (Personal Laws) پر عمل پیرا ہونے کی آزادی ہوگی۔۔۔ یعنی ان کے نکاح' طلاق' وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ جب یہاں مسلمانوں کو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس قدر آزادی ہوگی' تو پھر ایک الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ڈھونگ ہے۔ جناحؒ کے وکیلانہ حربے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

ان کا یہ پراپیگنڈہ بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا' اس لئے عوام (تو ایک طرف' عام تعلیم یافتہ) خواص تک کو یہ سمجھانا بڑا مشکل تھا کہ اسلام' اسی کا نام نہیں جسے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ اسلام (بہ حیثیت نظامِ زندگی) اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے' جس کی ہندوستان میں تو ایک طرف' دنیا کی کسی غیر اسلامی مملکت میں بھی آزادی نہیں مل سکتی۔ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تھی بنیادی وجۂ نزاع اور بنائے اختلاف۔ آپ طلوعِ اسلام کے اس دور کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو صفحات کے صفحات اسی بحث سے لبریز نظر آئیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوال تھا بھی بڑا لطیف اور دقیق۔ مسلمان ہزار سال سے اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتا چلا آ رہا تھا جسے یہ (علماء) حضرات اسلام کے نام سے پیش کرتے تھے اور جس کی آزادی کی ضمانت ہندو دے رہا تھا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ جس قدر اسلام' یہ حضرات پیش کرتے تھے' اسلام اتنا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا تھا' اس میں اس قدر غیر اسلامی (عجمی) عناصر شامل ہو چکے تھے کہ اصلی اسلام اس ملبہ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ مدفون اسلام کو اس ملبہ سے باہر نکالنا' بڑی کوہکنی اور خارہ شگافی چاہتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد کے خطبہ میں کہا تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ اس سے اسلام پر سے وہ نقش مٹا دیا جا سکے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔ اس نقش کو مٹانا (یا سعید حلیمؒ پاشا کے الفاظ میں' اس قشر کو کھرچنا) بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا' بالخصوص

جب مذہبی پیشوائیت پوری تندہی کے ساتھ اس کی مخالفت کرتی ہو اور اس کی پشت پر ہندو کی پوری تائید اور امداد موجود ہو۔

ان مخالفین میں اکثریت تو ان کی تھی جو دیانتداری (لیکن بربنائے جہالت) اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے جو امت میں متوارث چلا آ رہا تھا لیکن ایک عنصر ایسا بھی تھا جو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر اقبالؒ یا قائداعظمؒ کے پیش کردہ اسلام کی مخالفت کرتا تھا اور یہی طبقہ زیادہ مؤثر اور فعال تھا۔ وہ اسلام جسے یہ حضرات پیش کرتے تھے' اس میں' اپنے دائرے کے اندر ان کی اپنی حکومت قائم رہتی تھی یعنی قوم اپنے مذہبی معاملات کے لئے ان کے فیصلوں اور فتوؤں کی محتاج رہتی تھی۔ انہیں یہ اقتدار انگریز کے زمانے میں بھی حاصل تھا اور ہندو بھی اسے قائم رکھنے کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے برعکس' حقیقی اسلام میں ان کا یہ اقتدار (بلکہ جداگانہ وجود ہی) ختم ہو جاتا تھا یعنی اس اسلام میں تھیا کریسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس باب میں نہ علامہ اقبالؒ نے کسی قسم کی مداہنت سے کام لیا' نہ قائداعظمؒ نے۔ انہوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں (بار بار) اس حقیقت کا اعلان کیا کہ پاکستان میں تھیا کریسی قطعاً نہیں ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے' اپنے خطبۂ الٰہ آباد سے بھی بہت پہلے' (مولانا) اکبر شاہ (نجیب آبادی) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ انشاء اللہ شائع ہوگا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہر حال اس تمام معاملے کے متعلق مفصل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا ہوگا۔
>
> (انوارِ اقبالؒ۔ شائع کردہ اقبالؒ اکیڈمی' ص 317)

انہوں نے 1932ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا' قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری' مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی' بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام' مئی 1978ء)

یہ تو ان کے نثری بیانات کے اقتباس ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ اور جس قدر ''مُلّا'' کے خلاف کہا ہے' وہ درحقیقت' مُلّا کے تصور کے اسلام اور تھیا کریسی کے خلاف جہاد ہے۔

اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ کی طرف آیئے تو انہوں نے بھی' لگی لپٹی رکھے بغیر' صاف صاف الفاظ میں کہا کہ تحریکِ پاکستان کا اہم مقصد' قوم کو مذہبی پیشوائیت کے رجعت پسندانہ اسلام کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ انہوں نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے' نوجوان طالب علموں سے کہا:

> مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل' کھیل رہے ہیں' وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک وشبہ تمہیں اس ناخوش آئند وغیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریر قائداعظمؒ'' حصہ اول' ص 48)

انہوں نے' 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں' مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے۔ (تقاریر۔ جلد دوم' ص 386)

انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد بھی' اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت نہیں ہوگی۔ انہوں نے' فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا:

> پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیا کریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 65)

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی ان تصریحات کے بعد' یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ علماء حضرات' مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ اسلام کا سوال نہیں تھا۔ ان کے ذاتی اقتدار کا سوال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اقتدار جو انہیں مسلمان سلاطین کی ہزار سالہ سیکولر حکومت کے تحت حاصل رہا۔ جسے انگریز نے بھی اپنے عہدِ حکومت میں برقرار رکھا اور جسے علیٰ حالہٖ رکھنے کی

ضمانت ہندو دے رہا تھا' پاکستان میں (صحیح معنوں میں) اسلامی حکومت میں' نہ صرف یہ کہ وہ ان سے چھن جائے گا' بلکہ ان کا جداگانہ تشخص بھی باقی نہیں رہے گا۔ بنابریں' فطری طور پر ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے۔

اقبالؒ یا قائداعظمؒ نے یہی نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں تھیا کریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے مثبت طور پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس مملکت میں' حکومت قرآن کے مطابق قائم ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کا تو خیر سارا کلام اسی نقطہ کی وضاحت ہے کہ' اسلامی حکومت' قرآن کی حکمرانی کا نام ہے جو حسبنا کتاب اللہ کہنے والوں کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے' قائداعظمؒ نے بھی اس باب میں کسی قسم کا شک وشبہ یا ابہام نہیں رہنے دیا تھا۔ حیدرآباد (دکن) میں ان کا وہ اعلان' جو طلوعِ اسلام کے صفحات پر بار بار شائع ہوتا چلا آ رہا ہے' اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
>
> (1) (اورینٹ پریس' بحوالہ روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 جنوری 1942ء' ص 3)

اس پر وہاں کے طلباء نے (جنہیں یہ انٹرویو دیا گیا تھا) کہا کہ جب یہ صورت ہے تو پھر مسلم لیگ اپنی تحریک کی مذہبی تعبیر وتشریح کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں' قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

> دِقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت' تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں' ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر' اہلیت واستعداد کے باوجود' مجھ میں یا آپ میں' یعنی اپنے سوا کسی اور میں' اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن

---

(1) ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے شماروں اور طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع شدہ کتب میں قائداعظمؒ کے اس بیان کی اشاعت کی تاریخ روزنامہ انقلاب کے حوالہ کے ساتھ ہمیشہ 8 فروری 1942ء چھپتی رہی ہے۔ مرحوم مقبول محمود فرحت صاحب (لندن) جب پاکستان تشریف لائے تو انہیں روزنامہ انقلاب کے متعلقہ شمارہ کی تلاش میں کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ضمن میں مسلسل کاوش اور لائبریریوں میں روزنامہ انقلاب کے پرانے فائلز دیکھنے کے بعد انہیں بالآخر اخبار کی متعلقہ کاپی لاہور میوزیم لائبریری میں دستیاب ہوگئی جس کے سرورق پر 8 دسمبر 1942ء غلط پرنٹ ہوا تھا۔ لاہور میوزیم لائبریری نے اس کی تصحیح کر کے 8 جنوری 1942ء جلد 16 بروز پنج شنبہ 20 ذوالحجہ 1360ھ کر دیا ہوا ہے۔ کیونکہ اس دن کے متعلقہ اخبار کے دیگر تمام صفحات پر یہی تاریخ مندرج ہے۔ ہم مرحوم مقبول محمود فرحت صاحب کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ ان کی یہ تحقیقی انیق بہت ہی فائدہ مند ہے' کیونکہ بعض لوگ قائداعظمؒ کے ان الفاظ کی صحت ہی کو مشکوک قرار دے دیتے تھے۔ روزنامہ انقلاب کی اس اشاعت کی تاریخ کی درستی پاکستانیات کے طالب علموں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ (مدیر)

اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے' انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

☆☆☆

ان علماء نے تحریکِ پاکستان کے دوران اپنی مخالفت مسلسل جاری رکھی لیکن جب ان کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا تو انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ واضح رہے کہ ان علماء میں گنتی کے چند ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی معتد بہ اکثریت اس کے مخالفین کی تھی۔ یہ پاکستان آ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ:

(i) پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ (ii) لہٰذا' یہاں اسلامی قوانین نافذ کرو۔

(iii) اسلامی احکام وقوانین کا علم اربابِ حکومت کو نہیں' علماء کو ہے۔ لہٰذا زمامِ اقتدار علماء کے ہاتھ میں دو۔

یعنی ہندوستان میں رہتے ہوئے اگر ان کا اقتدار' نماز' روزہ یا شخصی قوانین تک محدود رہتا تھا' تو یہاں ان کے عزائم پوری کی پوری حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ جب مودودی مرحوم سے کہا گیا تھا کہ اسلامی نظام یا دستور مرتب نہیں ہو رہا' تو انہوں نے کہا تھا کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دو جو جانتے ہیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ نظام اور دستور کس طرح مرتب نہیں ہوتا!

اگر اقبالؒ یا قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ ان کے اس مطالبہ کا جواب ویسے ہی دیتے' جیسے وہ تحریکِ پاکستان کے دوران دیا کرتے تھے۔۔۔ یعنی وہ قرآنی دستور و نظام مرتب کر کے دے دیتے۔ لیکن (قوم اور اس مملکت کی بدقسمتی تھی کہ) وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔

ہم گذشتہ اربابِ اقتدار میں سے کسی کی بھی مدافعت نہیں کرنا چاہتے' لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جسے یہ حضرات اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں' وہ اس دور میں ناممکن العمل ہیں۔ لہٰذا' وہ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتے تھے۔ اس سے انہیں' ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا نہایت عمدہ موقعہ ہاتھ آ جاتا تھا۔۔۔ اور پراپیگنڈہ کی جس قدر منظم اور مؤثر مشینری ان حضرات کے پاس ہے' دنیا کی کوئی حکومت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ ذرا اس پر نگاہ ڈالئے کہ پاکستان کے ہر گاؤں' ہر قصبہ' ہر قریہ' ہر شہر اور اس کی ہر گلی اور ہر محلہ میں مسجد (بلکہ مسجدیں) موجود ہیں۔ ان میں' روزانہ پانچ مرتبہ اور ہر ہفتہ' کسی اعلان' اشتہار یا دعوت کے بغیر لوگ از خود جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا' جس بات کو یہ پھیلانا چاہیں وہ ایک دن میں' بیک وقت' ملک کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ سوچئے کہ اس جیسی منظم پراپیگنڈہ کی مشینری دنیا کی کسی حکومت کے پاس بھی ہے؟ اس مشینری کی رُو سے یہ حضرات ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ اربابِ اقتدار ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ فاسق و فاجر ہیں۔ یہ احکام شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

ان کا مطالبہ کس طرح ناممکن العمل تھا اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ آج تک پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ 1951ء میں'

ملک کے تمام فرقوں کے نمائندہ علماء نے ایک متفقہ منشور شائع کیا تھا جس میں اسلامی نظام اور شریعت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس منشور میں ''متفق علیہ'' مطالبہ یہ تھا کہ ملک کے قوانین ''کتاب وسنت'' کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ بیس سال تک یہ حضرات اس مطالبہ کو دہراتے رہے اور ہر حکومت کو کوستے رہے کہ یہ لوگ ''کتاب وسنت'' کے مطابق قوانین مرتب نہیں کرتے۔ بیس سال کے مسلسل پراپیگنڈہ کے بعد اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں سے (اگر سب سے زیادہ مشہور نہیں، تو مشہور تر) شخصیت، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اعتراف اور اعلان کیا کہ کتاب وسنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں۔

یعنی جب اربابِ حکومت اس مطالبہ کو ناممکن العمل کہتے تھے تو انہیں ملحد و بے دین کہا جاتا تھا۔ لیکن جب مودودی (مرحوم) نے اسے ناممکن العمل قرار دیا تو ان میں سے کسی نے ان کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس لئے کہ سب جانتے تھے کہ مودودی (مرحوم) نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے!

جب مودودی (مرحوم) سے پوچھا گیا کہ اگر ''کتاب وسنت'' کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو پھر کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کردی جائے۔ (حالانکہ اس فقہ کو وہ خود ''منجمد شاستر'' قرار دے چکے تھے)۔ چونکہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند تھی، اس لئے انہوں نے اس تجویز کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ اس طرح یہاں وہ تھیاکریسی مسلط ہوگئی جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی گئی تھی اور یوں ان علماء کی وہ شکست جو انہیں تشکیلِ پاکستان کی رُو سے اٹھانی پڑی تھی، مبدل بہ فتح ہوگئی۔ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ یہ (ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ احکام) ممکن العمل بھی ہیں یا نہیں، اور جو فرقے اس فقہ کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے، ان کا ان کے خلاف کیا ردِعمل ہوگا اور ملک کی سالمیت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کی روشنی میں ہم نے کہا تھا کہ وہ یومِ آزادی، جس کی آمد آمد کبھی روزِ عید سے بھی زیادہ وجۂ شادمانی ہوتی تھی، اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

غم کسے کہتے ہیں، اندازہ ہوا
یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا

بایں ہمہ، ہماری اب بھی یہی دعا اور کوشش ہے کہ خدا اس خطۂ زمین کو قائم و دائم اور مستحکم و پائندہ رکھے، کہ اس کے وجود کے ساتھ، قرآنی نظام کی امیدیں وابستہ ہیں۔

غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

☆☆☆☆

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلدِّیْنُ یُسْرٌ

(زیر نظر مضمون، رسالہ تہذیب الاخلاق میں 1879ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حالی نے بتایا یہ ہے کہ وہ دین جو خدا کی طرف سے ملا تھا، سیدھا سادہ اور آسان تھا۔ اس میں "نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی گئی تھی نہ عبادات میں کوئی ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا جو ناقابلِ برداشت ہو۔" لیکن اس کے بعد اس دین پر "حاشیے چڑھائے گئے۔" اور ان عناصر کو بھی دین کا جزو بنا دیا گیا جنہیں دین سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس طرح یہ صاف اور سادہ دین، عجیب گورکھ دھندا سا بن گیا۔ ان حاشیوں میں پہلا حاشیہ یہ تھا کہ نبی اکرمؐ نے جو امور محض عرب کی معاشرت کے لحاظ سے اختیار کئے تھے (مثلاً رہنے سہنے کا طریق وغیرہ) انہیں بھی ناقابلِ تغیر شریعت قرار دے دیا گیا۔ دوسرا حاشیہ یہ تھا کہ دین کی روح پر نگاہ رکھنے کے بجائے رسوم و آداب کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ جس کی وجہ سے یہ نظام زندگی بننے کے بجائے میکانکی طریق عمل بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے چار اور حاشیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم اس مضمون کی ابتداء تیسرے حاشیے سے کرتے ہیں اور حواشی اور غیر ضروری حصوں کو حذف کر کے باقی مضمون آخیر تک شائع کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام)

وضعی حدیثیں

تیسرا حاشیہ: واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خود غرضوں کی بددیانتی سے اس پاک دین پر چڑھا۔ انہوں نے اعمال ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لئے سینکڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پا گئیں۔ اگرچہ محققین نے ان کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی موضوعات اور مفتریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہو سکا جدا کیا مگر ان کی جرح و قدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی اور واعظوں کے رنگین فقرے جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وباء کی طرح پھیل گئے۔

علماء کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ جامع الاصول اور شرح نخبۃ الفکر وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے) اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے ذریعہ حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے۔ اسی بناء پر بے شمار حدیثیں ترغیب کے لئے وضع کی

گئیں۔ مثلاً مؤذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ ان کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لئے ولو کان نبیا اوامامًا کوئی درجہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ مثلاً یہ حدیث کہ ''موذن کے لئے ہر شے جس کو اس کی اذان کی آواز پہنچی ہے پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر قیامت کے دن سب ہی گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا۔'' یا یہ حدیث کہ قیامت کے دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور سندس اور استبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی۔ پھر ان پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن تا کہ ان پر آ کر بیٹھیں۔'' یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں جیسے:

''جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا جب تک وہ چراغ روشن ہے اس کے لئے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں۔''

''جس نے مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا اس پر ستر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا۔''

''جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی اس نے گویا چار سو حج کئے اور چار سو بردے آزاد کئے۔ چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کئے۔''

یا مثلاً حفظۃ القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ حافظِ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر''۔ اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کئے اور ان کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا۔

ترہیب و تخویف کے لئے بھی ایسے ہی مبالغے کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں۔ مثلاً

''جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔''

''مسجد کے ہمسائے کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی۔''

''جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے خدا اس کے تمام اعمالِ حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے۔''

''جس نے بے نماز کی مدد ایک لقمے سے کی۔ اس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی۔''

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لئے بنائی گئیں۔ مثلاً

''جس نے نماز میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔''

''جس نے رکوع میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے۔''

جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبریل سے پوچھا کہ نحر سے کیا مراد ہے۔ کہا یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو۔

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں جیسے امام شافعیؒ اور امام اعظمؒ کی مدح یا ذم میں یا جیسے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں:

''خدا کے نزدیک تین امین ہیں۔ میں۔ جبریل۔ اور معاویہ''۔

''ہر امت کے لئے ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے۔''

''ایک بار آنحضرتؐ نے جبریل سے ہاتھ ملانا چاہا۔ جبرئیلؑ نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ آپ نے سبب پوچھا۔ کہا۔ تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔''

''جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کر لینا چاہئے۔''

امام ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس ورئیس وہب بن وہب اور قاضی بختری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں۔

انہی تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد بن عکاسہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریانی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ جن کی حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ ہیں۔

پہلا گروہ: بعضے تارکِ دنیا ہیں جنہوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت کی۔

دوسرا گروہ: بعضوں کی تحریریں ضائع ہو گئیں اور انہوں نے اپنی یاد کے بھروسہ پر غلط روایتیں کر دیں۔

تیسرا گروہ: بعضے ثقات بھی ہیں جو بڑھاپے میں آ کر خرف ہو گئے۔

چوتھا گروہ: بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو ان کو صحیح روایت کرنے سے شرم آئی۔

پانچواں گروہ: بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنہوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لئے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں۔ حماد بن زید نے کہا ہے کہ ''زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔'' جس وقت ابن ابی العوجاء کو وضعِ حدیث کے جرم میں قتل کرنے لگے تو اس نے اقرار کیا کہ ''میں نے تمہارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا ہے۔

چھٹا گروہ: بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب واجر کی امید پر ترغیب وترہیب کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے۔ گویا ان کے نزدیک شریعت ناقص تھی جس کی تکمیل کی ضرورت تھی۔

ساتواں گروہ: بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں۔ چنانچہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اس نے کہا کہ حدیث کے لینے میں احتیاط کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبوی کے پیرایہ میں بیان کر دیا۔

آٹھواں گروہ: بعضوں نے یہ ٹھہرا لیا تھا کہ جس کا کوئی

عمدہ قول ہاتھ لگے۔ اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجئے اور نبی تک اسناد کو پہنچا دیجئے۔

نواں گروہ: بعضوں نے سلاطین وملوک کو خوش کرنے اوران کا تقرب حاصل کرنے کے لئے یہ شیوہ اختیار کیا تھا۔

دسواں گروہ: بعضے قصہ گو اور واعظ تھے جو لوگوں کو حسن بیان پر فریفتہ کرنے کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتب صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ انتہیٰ۔

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع وافترا کے بیان کئے ہیں۔ من شاء فلیر جع الی الفوائد المجموعة لمحمد بن الشوکانی۔

تفسیریں

چوتھا حاشیہ: یہ چڑھا کر مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف ومنکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابل نفریں کام انہوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعین، تبع تابعین ومن بعدہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بحسب ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لئے حدیث نبوی کے پیرائے میں نقل کر دیئے گئے۔

یہودیوں سے سنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھر دیئے گئے۔

بہت سے مسائل اصول وفروع کے قرآن شریف کی عبارات واشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کئے گئے۔ نہ اس کی تائید کے لئے کوئی حدیث صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی اور تابعی کا قول لکھا۔

جن موجودات علوی وسفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے ان کے حقائق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفۂ یونان کے موافق کی گئی۔

متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا اور وحیٔ سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا۔

شرح جامع صغیر میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ ''تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔''

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابو الامداد ابراہیم نے قضاء الوطر حاشیہ۔ نخبۃ الفکر میں اور ملا علی قاری نے شرح لشرح نخبۃ الفکر میں اور علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام قصے اہل کتاب کے ہاں سے لئے گئے۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اہل کتاب کی بہت سی کتابیں بہ قدر ایک بارشتر کے ہاتھ لگی تھیں۔ سو جو باتیں ان سے بکثرت منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہل کتاب کی ہیں اور اسی طرح بہت سی روایتیں حضرت عبداللہ بن سلام سے بھی اسی قسم کی مروی ہیں۔ پھر

مفسرین کے دوسرے طبقہ میں مجاہد اور تیسرے طبقہ میں مقاتل بن سلیمان اور ان کے سوا اور لوگوں نے صدہا قصے اہل کتاب سے اخذ کئے ہیں۔

علم الکلام: متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر۔ شام۔ یونان اور قبرص وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان کے ترجمے عربی زبان میں ہونے شروع ہوئے اور فلاسفہ کے مختلف خیالات اور ان کی مختلف رائیں جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور حاکم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفے کی چکنی چپڑی اور دلفریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی۔ کیونکہ حکماء کے مقالات بظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے اور مذہبی تعلیمات محض حسنِ عقیدت یا وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں۔

دوسرے اہل نفاق کے شبہے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے۔

پس دین کے ہوا خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفہ یونانی کے مقابلے میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ جیسا کہ انسان کی طبیعت کا مقتضاء ہے اس جدید فلسفہ میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھا دیئے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں۔ چونکہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں اس لئے ضروری تھا کہ ان کی رایوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں۔ پس اس طرح دین اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے۔ مگر علماء نے کھینچ تان کر ان لاانتہا جماعتوں کو تہتر فرقوں میں محدود کر دیا تاکہ حدیث **ستفترق امتی ثلثة و سبعین فرقة کلھم فی النار الا واحدة** کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے۔ اگرچہ ان تہتر فرقوں میں سے معدود فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا ان کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دنیا میں نہیں پایا جاتا مگر صدہا اور ہزارہا کتابیں ان کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

علم کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے ان کا جاننا اور سمجھنا اور یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اشاعرہ کے ہاں جو آج کل ''اہل سنت والجماعت'' کے نام سے مشہور ہیں ان باتوں کا انکار کرنا کہ صفات باری تعالیٰ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ نہ لاعین نہ لاغیر۔ یا یہ کہ خدا تعالیٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لئے جنت میں بھیج دے تو اس کی طرف حیف ومیل کی نسبت نہیں ہو سکتی یا یہ کہ خلفاء کی

فضیلت ایک دوسرے پر خلافت کی ترتیب کے موافق ہے۔ یعنی ہر خلیفہ سابق خلیفہ لاحق سے افضل ہے' بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا۔ اگر کوئی شخص مثلاً رویت بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبوی جو رویت بصری پر دلالت کرتی ہے اس کی تاویل کرے یا حضرت علی مرتضیٰؓ کو شیخین کے برابر یا ان سے افضل سمجھے وہ فوراً جماعت اہل سنت سے باہر ہو جاتا ہے اور ان فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت کلھم فی النار کہا گیا ہے۔ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور امام رازیؒ کی اکثر مبسوط کتابیں جو علم کلام میں ہیں اور صواعق محرقہ اور صواقع کا بلی اور تحفہ اور منتہیٰ الکلام اور ازالۃ الغین اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لئے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے سب اول سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدع سمجھا جاتا ہے۔

تقلید

چھٹا حاشیہ: تقلید و بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ یہ حاشیہ اصل دین سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو کتب سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے۔

کتاب اللہ سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی کہ: ذرا ذرا سے بچے اسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں یا بڑے ہو کر اس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں یا ختموں اور عرسوں میں اس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں یا نئے مردوں کی قبروں پر اس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے یا رمضان کی تراویح میں اکتا اکتا کر اور پچھتا پچھتا کر اس کا ایک ختم وہ لوگ سنیں جو اس کا ایک حرف نہیں سمجھتے۔

سنت رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی حال ہے کہ اول تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحہ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں اور اگر چند نفوس متبرکہ باقی ہیں ان کا لے دے کے یہ کام ہے کہ صحاح کے اول و آخر کے چند صفحے تبرکاً و تیمناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دیئے اور اس کو علم حدیث کی سند لکھ دی۔ شاگرد اور استاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کچھ کام پڑے گا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلے کا جواب اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک قاضی خان اور عالمگیری یا بحر الرائق وغیرہ کی عبارت اس میں درج نہ کی جائے۔ گویا قرآن اور حدیث کے مخاطب صحیح تمام امت میں چند آدمی تھے جو ان کا لب لباب نکال کر کتب فقہ میں درج کر گئے۔ اب کتاب وسنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں۔

من ز قرآں مغز را برد اشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں ان کا دین سے جدا کرنا اور

گوشت کا ناخن سے جدا کرنا برابر ہے۔ دو پلڑی ٹوپی۔ پردہ دار انگرکھا۔ ڈھیلا یا تنگ مہری کا پائجامہ۔ نوکدار جوتی۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان میں آ کر انہوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہوگئی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو وہ ''کرسٹان'' کا خطاب پاتا ہے۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ جتانا ہے کہ دین اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسوم و بدعات کا ہے۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیے اس سیدھے سادے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علمائے دین دوشِ اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار ہوتا چلا جائے شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گذرا ہو جس میں امت کے لئے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسول کی تکلیفیں ناکافی خیال کی گئی ہوں اور اس کی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے۔ مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لئے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ دین محمدیؐ کی شان و شوکت دنیا میں قائم رہے اور امت محمدیہؐ اپنے ہمعصروں کی نظر میں حد سے زیادہ حقیر و ذلیل نہ ہو جائے اس قدر کام درپیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے۔ اسلام پر حاشیے چڑھتے چڑھتے جو صورت اب اس کی ہوگئی ہے اگر اسی کو اسلام سمجھا جائے تو عن قریب کسی مسلمان کو ضروریات دین سے اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ وہ نہایت ذلت و خواری سے دونوں وقت قوت لایموت بہم پہنچا کر بری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے چہ جائیکہ وہ دنیا میں عزت سے رہ سکے یا دین کی کچھ شان و شوکت بڑھا سکے۔ جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے۔ اس میں ادنیٰ درجے کی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت ہی کے لئے درکار تھیں کیونکہ ترقی انسان کا زمانہ اس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اس زمانہ کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے برخلاف اپنے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کرے۔

خالص اسلام: ہم کو دین کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے بھی ضرور ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں

ں کو حشو و زواید سے پاک کر کے تمام عالم کو دکھا دیں کہ
ں اسلام ہی دنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور
ری کو ترقی دینے والا ہے۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے جو اسلام کی
ت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں اس سے ان کی کمال
ق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے جیسا کہ ان
یفات سے ظاہر ہے اس سارے مجموعہ کو اسلام نہیں سمجھا
ں پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنی
یت گہری نگاہ سے اس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کر کے
یٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور طرف اسی پر اپنی اپنی
ئیں لکھی ہیں۔ اگر وہ اس تمام مجموعہ کو جس کو ہمارے بھائی
سلمان اسلام سمجھتے ہیں ٹھیٹ اسلام جان کر اسی پر رائے لکھ
یٹھتے تو ان کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی
جازت نہ دیتا۔ جو مسلمان اس زمانہ کے موافق تعلیم پا رہے
ہیں یا آئندہ پائیں گے وہ جب ہی تک اسلام پر ثابت قدم
رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعہ کو اسلام نہ سمجھیں۔ اگر بدنصیبی
سے انہوں نے بھی اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ ان
غریبوں کی نوبت الحاد وارتداد تک پہنچ جائے گی اور اسکا مظلمہ
ان مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی مہیب اور
ڈراؤنی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے
ہیں۔

ہم جو دنیا کے تمام ادیان اور ملل میں سے صرف
دین اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے ہیں اور اس کے سوا
اور دینوں کو ایسا نہیں جانتے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں
کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے
نہیں ہیں کیونکہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ: وَاِنْ مِّنْ
اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (24:35) یعنی کوئی قوم ایسی
نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔'' اور یہ بھی ارشاد
ہوا ہے کہ: مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ
(40:78) یعنی ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ پر (اے
نبی آخر الزماں ﷺ) ظاہر نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے کہ جو اوپر
مذکور ہوئی اور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ اس سبب سے
دیتے ہیں کہ جس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اس وقت
ادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں
رہا تھا اور انسان کی افراط وتفریط سے حق اور باطل مل جل
کر ایک ہو گئے تھے۔ شرک و بدعت نے توحید اور سنن
راشدہ کو دبا لیا تھا اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور
مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو
سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔

نبی آخر الزماں ﷺ نے آ کر حق کو باطل سے جدا
کیا اور جو کھوٹ اور ملاؤ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اس کو
دور کر کے ایک خالص کندن نکالا اور اسی کا نام اسلام
رکھا۔

اب اگر اسلام بھی شرائع سابقہ کی طرح اپنی
اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ
''ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان ایسے نہیں ہیں۔''
فقط۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے

(قسط نمبر 3)

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

(خدائی فیصلے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حالت اُس وقت یہ تھی کہ یروشلم پر حکومت تو رومیوں کی تھی لیکن بنی اسرائیل پر اقتدار، مذہبی پیشواؤں کا تھا۔ یہی وجہ ہے جو آپ انجیل میں دیکھیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین و توبیخ کا سارا رُخ ہیکل کے انہی پجاریوں کی طرف تھا۔ دیکھئے وہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بیباک، حق گو پیامبرِ انقلاب کی طرح اُن سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو، اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر وہ مقدِس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو! کونسا بڑا ہے سونا یا مقدِس۔ جس نے سونے کو مقدِس کیا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دھمکی دیتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔۔۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کی مانند ہو ــــ جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو

ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔۔۔اے سانپو، اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟
(متی، باب:23، آیات:36-1)

ی اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:
یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ
اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے
ڑے رکھتے ہیں۔ ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام
پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)
نی اسرائیل کے علماء و مشائخ کی حالت، اور یہ تھا وہ مشن جسے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ
خود خدا بنے بیٹھے تھے، اس تنقید کو کس طرح گوارا کر لیتے۔ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھڑا
وام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہارے عقائد خراب کرتا ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی
انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ اس میں لکھا ہے۔
ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر
ت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔۔۔تب اس جیسے آدمی کی
کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائینگے۔ اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے
ر ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔
پ نے غور کیا، عزیزانِ من! کہ مسئلہ سارا معاشی تھا جسے وہ مذہب کا نقاب اوڑھا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے
ور بھی زیادہ غور طلب ہے، مذہبی پیشوائیت ہمیشہ سیکولر نظامِ حکومت سے خوش رہتی ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا تعلق
ور سے رہتا ہے اور مذہبی امور کے دائرے میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دین
م میں مذہبی اور سیاسی دونوں دوائر، حکومت کی تحویل میں ہوتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس خطرہ کی
شارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:
س وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پروا نہیں
جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں۔ پس اگر ہم
ی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ
(انجیل برنباس، ص:142)

چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف کفر والحاد کا فتویٰ مرتب کیا اور اس جرم کی پاداش میں ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ وہاں کے مروجہ قانون کی رُو سے، ہیکل کے یہ پجاری، موت سے کم ہر قسم کی سزا خود دے سکتے تھے۔ لیکن موت کی سزا کی توثیق حکومت سے کرانی پڑتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے رومیوں کے گورنر سے فتویٰ پر دستخط کرالئے اور یہ نہ سمجھے کہ یہ، حضرت مسیح علیہ السلام کا نہیں بلکہ خود ان کے اپنے قتل کا محضر نامہ (Death Warrant) ہے جس پر وہ دستخط کرا رہے ہیں۔ وہ قتل نامہ جس پر قریب ستر سال بعد (70ء میں) خود رومیوں ہی کے ایک اور گورنر (ٹائیٹس) کے ہاتھوں اس طرح عمل ہوا کہ نہ ہیکل رہا اور نہ ہیکل کے یہ خدا ــــــ حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

حضرت مسیح جس قسم کا انقلاب لائے اس کی تفصیل قرآنِ کریم میں نہیں آئی۔ نہ ہی انجیل میں اس کی صراحت ملتی ہے البتہ ان دونوں میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے اس انقلاب کی ایک خفیف سی جھلک سامنے آجاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت مسیح کی دعوت یہ تھی کہ:

اے محنت کشو! اے بوجھ سے دبے ہوئے مزدورو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام دوں گا۔

دوسری طرف وہ سرمایہ داروں سے کہتے ہیں کہ:

اپنے واسطے زمین پر مال مت جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا لگتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے ہیں اور چراتے ہیں۔۔۔ یاد رکھو! تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی: 28۔19:6)

اس کے لئے انہوں نے جو عملی نظام قائم کیا تھا، اس کا نقشہ، کتاب اعمال میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ:

اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ وہ اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (اعمال: 45۔2:44)۔

دوسری جگہ ہے:

اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کوئی بھی اپنے مال کو اپنا نہیں کہتا تھا۔ ان کی سب چیزیں مشترک تھیں۔۔۔ اور ان سب پر فضل تھا کیونکہ ان میں کوئی بھی محتاج نہیں تھا۔ اس لئے کہ جو لوگ زمینوں اور گھروں کے مالک تھے ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور رسولوں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔ (اعمال: 35۔4:32)

یہ تھا وہ اقتصادی نظام جسے جنابِ مسیح علیہ السلام نے قائم فرمایا تھا۔

.....*.*.....

قرآن کی مخاطب قوم:

یہ تھیں اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں جنہیں قرآنِ کریم نے اپنی سب سے پہلی مخاطب قوم کے سامنے پیش کر کے، ان سے کہا کہ یہ تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں اور ان کے ساتھ ہی، ان اقوام کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات بھی جن کے پاس سے تم اکثر گزرتے رہتے ہو۔ تم انہیں نظرِ غائر سے دیکھو اور سوچو کہ یہ تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ جس قوم میں اس قسم کے جرائم پیدا ہوئے جن کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ قوم تباہ و برباد ہوگئی۔ یہاں تک تو تم تاریخی شواہد سے دیکھ سکتے ہو۔ اب اس کے بعد تم اس حقیقت کو سن لو کہ یہ کچھ محض اتفاقیہ طور پر نہیں ہوگیا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو پہلے بھی کارفرما تھا اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)

خدا کی وہ روش جو اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں کارفرما تھی، تو اس روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔

تمہارا نظام بھی اسی قسم کا تخریبی ہے جیسا اُن اقوام کا تھا۔ اس لئے اگر تم نے اسے تبدیل نہ کیا تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان اقوام کا ہوا تھا۔ وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ (23:44) جس طرح وہ مٹ گئیں اور ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں اسی طرح تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری بھی فقط داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم اپنے لئے کیا چاہتے ہو! شوکت و ثروت اور عزت و آبرو کی زندگی یا تباہی و بربادی کا ہولناک انجام! جن سعید نفوس نے اس پیغام کو بگوشِ ہوش سنا، انہوں نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح وہ بتدریج جماعتِ مومنین وجود میں آگئی جس کا مقصدِ حیات ایسا نظام متشکل کرنا تھا جو مستقل اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو، اور اس میں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی نہ ہو جن کا نتیجہ قرآن نے امتوں کی ہلاکت بتایا ہے۔

جماعت مومنین:

چنانچہ انہوں نے وہ نظام قائم کیا، اور آسمان کی آنکھ نے جہاں یہ عبرتناک مناظر دیکھے تھے کہ غلط نظام کے ہاتھوں بڑی بڑی شوکت و سطوت کی مالک قومیں کس طرح راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح اس نے یہ درخشندہ و تابناک منظر بھی دیکھا کہ صحیح اقدارِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے سے کس طرح ایک اونٹ چرانے والی قوم، چند ہی دنوں میں، تہذیب و تمدن کی ان بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس قوم کے جلو میں کس

طرح کاروانِ انسانیت رواں دواں، اور شاداں وفرحاں، اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے، اس سکون واطمینان کے ساتھ کہ: فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (2:38) نہ اس قافلہ کو بیرونی خطرات کا کوئی خوف ستاتا ہے اور نہ ہی افرادِ کارواں کے لئے قلبی حزن وملال وجہ افسردگی اور موجبِ پریشانی بنتا ___ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (13:29)

اس جماعت سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا تھا کہ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو ہر وقت سامنے رکھیں اور اس کی جانچ پڑتال کرتے رہیں کہ ان میں کوئی ایسی خرابی نہ پیدا ہونے پائے جو قوموں کی تباہی کا موجب بنا کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چند ایک بنیادی اصولوں کو بھی یاد رکھیں۔ مثلاً:

اصولِ حیات:

(1) تمہیں یہ مقام جسے استخلاف فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے، ایمان اور عمل کے نتیجہ میں ملا ہے (24:55) ایمان کے معنی ہیں مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور عمل کے معنی ہیں ان اقدار کے مطابق نظامِ زندگی کی تشکیل جب تک تمہاری یہ کیفیت رہے گی، تمہارا بلند وبالا مقام قائم ودائم رہے گا۔

(2) دوسرا اصول یہ ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (13:11) جو مقام کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے وہ اس سے کبھی نہیں چھنتا جب تک وہ اپنے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرلے جو اسے اس مقام کا اہل نہ رہنے دے۔ نفسیاتی تبدیلی تعلیم وتربیت سے ہوتی ہے اس لئے اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اس انداز سے کرنا کہ ان میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر واقعہ نہ ہونے پائے جو انہیں تباہی کی طرف لے جائے۔

(3) اپنے ہاں معاشی نظام اس قسم کا رائج رکھنا جس میں ذرائع پیداوار اور مال ودولت ہر ایک کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لئے کھلے رہیں۔ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47:38) اگر تم نے اس قسم کے نظام سے اعراض برتا تو یاد رکھو، تمہاری جگہ کوئی اور قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ (70:40)

(4) جب کسی قوم میں ظلم عام ہوجائے تو وہ تباہ ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ (21:11) ظلم کا مفہوم تو بڑا وسیع ہے لیکن اس کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس شے یا جس شخص کو جس جگہ ہونا چاہئے اُسے وہاں نہ رکھنا۔ ظلم سے قوموں کی جڑ اس طرح کٹ جاتی ہے کہ خلقِ خدا ان کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (6:45)

(5) اور سب سے آخر یہ کہ دنیا میں حق اور باطل کی کشمکش ہر وقت جاری رہے گی۔ تم باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے

لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد رہو اور اس مقصد کے لئے تمہیں جان تک بھی دینی پڑے تو بلا تامل وتوقف دے دو۔ اگر دنیاوی جاذبیتوں نے تمہارا راستہ روک لیا اور تم نے جہاد سے گریز کیا تو وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ (9:39) تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

یہ تھے وہ اصول وضوابط جو خدا نے اس قوم کو دیئے جس نے خدا کے نام پر مملکت قائم کی۔

ملتِ پاکستانیہ:

اور وہاں سے آگے بڑھ کر آپ اس قوم کی طرف آجایئے جس نے تیرہ سو سال کے بعد، ایک بار پھر، خدا کے نام پر قائم کرنے کے لئے ایک مملکت کا مطالبہ کیا اور اسے وہ مملکت عطا کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت اور اس کی حامل قوم کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنا اس قوم کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں جسے اس حقیقت پر ایمان ہو کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج وزوال سے متعلق قوانینِ خداوندی اٹل ہیں۔ انہی کے مطابق اقوامِ سابقہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوا تھا انہی کی رُو سے ہمارے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ (3:137) اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد تمہارے سامنے ہیں۔ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (3:137) تم دنیا میں چلو پھرو، اور نگہ بصیرت سے دیکھو کہ جن اقوام نے ان قوانین کو جھٹلایا تھا ان کا انجام کیا ہوا۔ اور اس کے بعد کہا کہ یہ حقیقت کسی خاص قوم، خاص زمانے یا خاص مقام تک محدود نہیں۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (3:138) یہ تو عالمگیر انسانیت کے لئے واضح حقیقت ہے وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (3:138) دنیا کی جو قوم بھی چاہے کہ وہ ان خطرات سے محفوظ رہے جن سے اقوامِ سابقہ دوچار ہو کر تباہ ہوئی تھیں تو وہ ان کے احوال وکوائف سے عبرت اور اِن قوانین سے راہنمائی حاصل کرے۔

لہٰذا ہمیں دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کونسی خرابیاں تھیں جو اقوامِ سابقہ کی تباہی کا موجب بنیں۔ اور پھر اس کا جائزہ لینا کہ وہ خرابیاں ہمارے ہاں تو نہیں پیدا ہو گئیں۔ یہ خرابیاں، قوم بہ قوم، گنائی جا چکی ہیں لیکن چونکہ ہم کافی لمبی مسافت طے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اس سفر کے بعض سنگِ میل ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہوں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کی مختصر سی فہرست ایک بار پھر سامنے لے آئی جائے تا کہ اس سے تجدید یادداشت ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کو اچھی طرح سامنے رکھئے کہ بنیادی جرم تو دراصل ایک ہی ہے جس سے قوموں کی تباہی ہوتی ہے یعنی وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار سے بے اعتنائی برتنا اور معاشرہ کا نظام اپنے خود ساختہ قوانین وضوابط کے مطابق متشکل کرنا۔ باقی جرائم اسی اصل کی مختلف شاخیں ہیں لیکن چونکہ وہ جرائم نمایاں اور محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اس لئے ان کے تذکرہ سے بات زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اب ان جرائم کی فہرست ملاحظہ فرمایئے جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ تباہ ہوئی تھیں۔

تباہ کن جرائم کی فہرست:

(1) جب کسی معاشرہ میں طبقاتی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں۔ عزت کا معیار دولت قرار پا جائے اور محنت اور دستکاری سے روٹی کمانیوالوں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جیسا کہ قومِ نوح علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔

(2) جب قومیت کا معیار، ایمان یا نظریۂ حیات کے اشتراک کے بجائے رنگ، نسل، وطن کا اشتراک قرار پا جائے تو اس کا نتیجہ بھی تباہی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ سے سامنے آتی ہے۔

(3) جو قوم جور و جبر سے حکومت کرے اور دوسروں کی محنت کی کمائی کا استحصال (Exploitation) ان کا شعار ہو وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی خواہ وہ تمدن و تہذیب کی کتنی بلندیوں تک کیوں نہ پہنچ چکی ہو، اور علوم سائنس میں کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ گئی ہو۔ قوم عاد کی سرگذشت سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(4) جس معاشی نظام میں ذرائع پیداوار ___ یعنی زمین اور اس کے متعلقات ___ پر ذاتی ملکیت جائز قرار دے دی جائے اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی نہ رہنے دی جائے، اس نظام اور اس کی حامل قوم کو دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ قوم ثمود کی سرگزشت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

(5) جس قوم کا کاروبار سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو یعنی اس میں سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہو کہ وہ محنت کشوں کو جو جی میں آئے، دے اور صارفین (Consumers) سے جتنا جی چاہے وصول کر لے، وہ ماپ اور تول کے پیمانے اپنی منفعت اور مصلحت کے مطابق رکھے اور اس پر اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہ ہو، وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت قومِ شعیب علیہ السلام کی سرگذشت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔

(6) اور اسی قوم کی سرگذشت سے یہ حقیقت بھی کہ جب مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ تک محدود کر دیا جائے اور اس کی ہر ایک کو آزادی ہو لیکن کاروباری معاملات میں اسے دخل نہ دینے دیا جائے۔ یعنی جہاں نظام سیکولر ہو۔ وہ قوم کبھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔

(7) اور قوم لوط کی سرگذشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم میں جنسی ضوابط اور پابندیوں سے بے اعتنائی برت کر فحاشی اور جنسی بدنہادی کو عام ہونے دیا جائے اس قوم کی کشتی بحرِ میت میں ڈوب جاتی ہے۔

(8) قومِ فرعون کے انجام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس قوم کی سیاست میں اندازِ ملوکانہ پیدا ہو جائیں، وہ قوم غرق ہو جاتی ہے۔ اندازِ ملوکانہ کی ابھری ہوئی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں حکمرانی قانون کی نہیں ہوتی، ایک فرد یا افراد کے مجموعے کے فصیلوں کی ہوتی ہے۔ اس میں قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور پھر پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر ان کی اجتماعی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جاتا ہے۔ اس میں، ان لوگوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے جن میں جوہرِ مردانگی نہ ہو اس

لئے وہ ہمیشہ ہیئتِ حاکمیہ کے تابع فرمان رہیں۔ جن لوگوں میں ذرۂ برابر بھی غیرت وحمیت کے آثار نمودار ہوں انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔

نیز اس نظام میں، رزق کے سرچشمے، قوم کی تحویل میں رہنے کے بجائے ہیئتِ حاکمیہ کی ذاتی ملکیت متصور ہوتے ہیں اور اس طرح یہ حکمران طبقہ قوم کا اَن داتا بن کر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ طبقہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اپنے حریفوں کو ان کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر، انہیں ختم کر کے رکھ دے۔

(9) قوم بنی اسرائیل گویا ان تمام جرائم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ ان کا نظامِ زندگی، ربٰو اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر استوار تھا۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کا نظام کیپٹل ازم اور تھیا کریسی کے ستونوں پر قائم تھا۔ سرمایہ داروں کی کھلی چھٹی تھی کہ وہ جس طریقے سے چاہیں دولت سمیٹتے چلے جائیں بشرطیکہ وہ صدقے اور خیرات کے کاموں میں چندہ دے دیا کریں اور مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کو قائم رکھیں۔ ان کے لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ان کی جھوٹی تعریفیں کرتے رہیں اور وہ کر کے کچھ نہ دکھائیں بلکہ محض بیان بازی کے زور پر پاپولیرٹی (Popularity) حاصل کرتے رہیں۔ جہاں تک مذہبی پیشواؤں کا تعلق ہے، مذہب ان کا پیشہ تھا اور دین فروشی ان کا ذریعہ معاش۔ وہ اپنے جی سے شریعت کے مسائل گھڑتے اور انہیں خدا کا دین کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ قوم مختلف مذہبی فرقوں میں بٹی ہوئی تھی اور ان فرقوں کے امام، ایک دوسرے پر کفر کے فتویٰ عائد کر کے، عوام کو آپس میں لڑاتے رہتے تھے۔ حکام کے ساتھ ان کی ساز باز تھی اور جس شخص کو دیکھتے کہ وہ ان کی مفاد پرستیوں کے راستے میں حائل ہے، اس پر کفر والحاد کا فتویٰ صادر کر کے، اس کی موت کے احکام صادر کرا لیتے۔ یہ تھے اس قوم کے کبیرہ جرائم جن کا نتیجہ ان کی ایسی تباہی تھی جو دنیا میں ضرب المثل بن کر رہ گئی۔ اس قوم کی سرگذشت سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس قوم کے معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ تباہ ہو جاتا ہے۔

.....*.*.....

باز بخویشتن نگر:

یہ ہے ان جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے اقوامِ سابقہ اپنے اپنے وقت میں تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان کی سرگذشتوں کو قرآنِ کریم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقائق اس قدر واضح اور یہ معیار اس قدر نکھرا ہوا ہے کہ اس کی موجودگی میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا، کسی کمیٹی بٹھانے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں اور ہماری حالت بالکل بے نقاب۔ آپ سوچئے کہ قوموں کو تباہ کرنے والے جرائم کی جو فہرست قرآن کریم نے پیش کی ہے، ان میں کوئی ایک جرم بھی ایسا ہے جو ہمارے معاشرہ میں عام نہ ہو چکا ہو اور اس کے بعد سوچئے کہ اگر ہماری حالت یہی رہے اور ہم اپنے موجودہ نظام کو نہ بدلیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں تباہ

ہونے سے بچا سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے بھی خواہانِ ملت قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے مختلف طریقے سوچ رہے ہیں لیکن معاف فرمایئے اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ ان سب کی نگاہ علاماتِ مرض پر ہے، علتِ مرض پر نہیں، ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اگر ہم زیادہ سے زیادہ عسکری قوت حاصل کرلیں تو پھر ہم ہر طرح سے محفوظ اور مامون رہ سکتے ہیں۔ اس میں یہ نہیں کہ عسکری قوت کو اگر حدودِ خداوندی کے تابع نہ رکھا جائے تو خود وہی قوت قوم کو تباہ کرنے کا موجب بن جایا کرتی ہے۔ دیکھئے وہ نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کیسے واشگاف الفاظ میں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قوت پر بڑا ناز ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہا کہ ان سے کہہ دو کہ ذرا تاریخی شواہد پر نگاہ ڈالو۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (47:13) کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ قوت حاصل تھی لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کی قوت ان کے کسی کام نہ آئی۔ وہ تباہ و برباد ہوگئیں اور کوئی ان کی مدد تک کو نہ پہنچا۔

بعض زور دیتے ہیں کہ یہ دور سائنسی ایجادات کا ہے اس لئے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ سے زیادہ زور دینا چاہئے۔ یہ دور سائنٹیفک ترقیوں کا ہو یا نہ ہو، قرآنِ کریم نے تو آج سے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا وجہ امتیازِ آدمیت ہے۔ اس لئے سائنٹیفک ترقیاں ہمارا فریضہ ہے لیکن اگر سائنٹیفک ایجادات کو مستقل اقدار کے سوا حل کا پابند نہ کیا جائے تو

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس نے کہا ہے کہ تم اقوامِ گذشتہ کے تاریخی نوشتوں کو دیکھو۔ تمہیں ان میں ایسی ایسی قومیں نظر آئیں گی جنہیں سماعت، بصارت اور ذہن سار کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (46:26) لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کے علم و ہنر کی صلاحیتیں ان کے کسی کام نہ آئیں اور وہ انہیں اس تباہی سے ذرا بھی محفوظ نہ رکھ سکیں جس کے متعلق وہ کبھی (Seriously) سوچا نہیں کرتے تھے وہ ان قوانین و اقدار کو مذاق سمجھتے تھے۔ لیکن فیصلہ کن حقیقتیں وہی ثابت ہوئیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغربی محققین بھی اپنی مدت العمر کی تحقیق و تفتیش کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مثلاً شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) کا مصنف برفا لکھتا ہے۔

> ”اگر انسان بادلوں سے اونچا اُڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہوگئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے، تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ قوت،

تہذیب، کلچر سب بے معنی ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جاسکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔"

(The Making of Humanity, Page.259)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل مسئلہ روٹی کا ہے۔ اگر اسے حل کرلیا جائے تو تمام خرابیاں رفع ہوسکتی ہیں۔ قرآنِ کریم روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھوک خدا کا عذاب ہے اور رزق کی فراوانیاں اس کی نعمتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی واضح کردیتا ہے کہ اگر رزق کی فراوانیوں کو مستقل اقدار کے تابع نہ رکھا جائے تو وہی فراوانیاں معاشرہ کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ سورۂ قصص میں ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ (28:58) ایسا بھی ہوتا ہے اب کوئی قوم ان اقدار کو فراموش کردیتی ہے جن کی انہیں اکثر یاددہانی کرائی جاتی رہی ہے تو ان پر سامانِ زیست کے پھاٹک کھل جاتے ہیں اور دولت و ثروت کی اس قدر فراوانیوں کی رو میں بہ جاتے ہیں تو ان پر اچانک تباہی آجاتی ہے۔ ایسی تباہی کہ انہیں بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے، تنہا روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ قوموں کے لئے تباہی سے بچنے کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے وہ بنیادی اصول جس سے ہر آسمانی پیامبرِ انقلاب نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ یعنی اِعْبُدُوا اللّٰهَ۔ جس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں اقدارِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ جواب قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب ملی ہیئت اجتماعیہ یعنی نظامِ معاشرہ کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو وہ قوم ہر لحاظ سے اَعْلَوْن کے مقام پر پہنچ جاتی ہے یعنی دنیا کی کوئی قوم اس کی ہمدوش نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر وہ ان اقدار سے بے اعتنائی برتتی ہے تو سیاسی غلبہ و تسلط، عسکری قوت و حشمت یا معاشی فراوانی و فراخی اسے تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ ایک بار پھر برفا کے الفاظ سنئے۔ وہ کہتا ہے:

"انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل کے اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔"

(The Making of Humanity, Page.159;262)

یہ ہے قرآنِ کریم کا آخری فیصلہ جس کی تائید خود مغرب کے دیدہ ور بھی کر رہے ہیں۔ ہم نے قرآنِ کریم کی روشنی میں، ان اقوام کی سرگذشتوں کا مطالعہ کرلیا ہے جو اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہوگئیں اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان اقوام میں اگر وہ کبائر الاثم ایک ایک دو دو کرکے اُبھرتے تھے تو پاکستان میں وہ سب کے سب یکجا ہوچکے ہیں اور دن بدن زیادہ سے زیادہ پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ ان حالات میں ہمارے متعلق خدا کے قانونِ مکافات کا فیصلہ واضح ہے۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں:

اس میں شبہ نہیں کہ یہ صورت حالات بڑی مایوس کن ہے لیکن ابھی اُمید کی کچھ کرنیں باقی ہیں۔ قرآنِ کریم ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غلط نظام کے تباہ کن نتائج آہستہ آہستہ مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ان کی آخری شکل وہ ہوتی ہے جب تباہی محسوس طور پر اس قوم کے سامنے آجاتی ہے اگر وہ قوم اس سے پہلے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلے تو اس کے بچاؤ کی صورت ہوسکتی ہے۔ لیکن جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آجائے تو پھر وہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ دیکھئے، سورۃ الانبیاء میں اس حقیقت کو کیسے محاکاتی انداز میں (Graphically) بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (21:11)۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو اپنے اس نظام کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافی پر مبنی تھا، تباہ ہوگئیں۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن مآل سے آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم جس روش پر چل رہے ہیں اس سے ہمیں فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس لئے اس کا نتیجہ تباہی کیسے ہوسکتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر مرتب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہوگئی۔ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (21:12) اور ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئی تو وہ لگے بھاگنے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا۔ لَا تَرْكُضُوْا بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (21:13)۔ چلو اپنے محلات کی طرف اور اس سامانِ تعیش کی طرف جو تم نے اس طرح فراہم کر رکھا تھا۔ چلو واپس تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے اتنا مال و دولت کہاں سے لیا تھا۔ وہ مظلوم کونسے تھے جن کے خون کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہ آرائش و زیبائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) چنانچہ جب انہیں گرفتار کرکے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم و استحصال سے حاصل کیا تھا فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ (21:15) وہ یہ واویلا مچاتے رہے لیکن اس وقت اس پکار اور فریاد نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا اور وہ قوم ایسی ہوگئی جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت ہو یا بجھا ہوا شعلہ۔

لہٰذا جس قلبِ حساس میں پاکستان کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس میں موجزن، اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو قرآنی اقدار کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہوجائے گی بلکہ عزت و ثروت کے اس مقام بلند پر پہنچ جائے گی جہاں سے انسان اپنے مقدر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔ لیکن اگر ان سے اعراض برتا گیا تو ہماری تباہی یقینی ہے یہی خدا کی سنتِ مستمرہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) اور سنت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔ یاد رکھئے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف (پرویز)

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عیدالضحیٰ

پرویز صاحب کی وہ تقریر جو نشرگاہِ دہلی سے 29 دسمبر 1941ء کی شام کو نشر ہوئی تھی۔ امسال اگرچہ COVID19 سے پیدا شدہ صورتِ حال کے پیش نظر حج کا اجتماع بین الاقوامیت کا حامل نہیں ہوگا۔ بہرحال پرویزؒ صاحب کی یہ تقریر حج اور عیدالضحیٰ کے اصل مقصد و معنویت کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ (ادارہ)

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے' لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے تحت' ایک خاص ترتیب سے' ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت' دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ' محسوس شکل میں' گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار۔ مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضانِ مبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیٔ ایمان' نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہوگئی تو عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل' بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ﴿۲۷﴾ (22:27) اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدوں میں خدا کا

پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۶﴾ (3:96) بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آ گیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ حبشی۔ افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ۔ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دے دیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔

تا کس نگوید بعد ازیں،
من دیگرم تو دیگری

یہ ہے وہ وردی جو اسی بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر امتیاز کو مٹاتے' وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے' اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام' ایک حاکم کے محکوم' ایک قانون کے تابع' ایک نظام کے پابند' فقیرانہ لباس' ننگے سر' گدایانہ وضع' قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز' مستانہ وار گذرتے ہوئے ایک کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بے تاب۔ دل وفورِ شوق سے بے قرار' آنکھیں مئے توحید سے نشہ بار لَبَّیۡکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیۡکَ کہتے ہوئے یوں رواں دواں' جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں' رنگ و بو کی فضاؤں کے جو ہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ' تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکھٹا کر دیا جائے۔

زمانۂ ابراہیمیؑ میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروانِ منزلِ شوق کے قافلے۔ حریمِ کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی

تجدید ہوئی کہ: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (6:162-163) میری نماز۔ میرا حج۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد، پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محوِ نیاز ہے، کوئی اس کا غلاف تھامے عالمِ وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل میں مقدس آرزوؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا نزول۔ غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

نخلستانِ حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے 8 تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں۔ نگاہیں عرشِ معلّٰی پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں، 9 تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد ایک ہی وضع، ایک ہی انداز، بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے، اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے۔ ان کا منتخب امام منبر رسول اللہ ﷺ پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا۔ جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں، التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع۔ زندہ آرزوؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملتِ حنفیہ کے پیشوائے اعظم۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس صحرائی قربانگاہ میں پہنچ کر ملتِ اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں۔ سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصدِ عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ۭ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا

هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (22:37) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگیٔ مقصد پہنچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں' دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (2:198) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28) تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں۔

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلہ خیالات ہوا۔ ادھر یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو' ٹی وی اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہنچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقاء کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے۔ پھولے۔ پھلے اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے' اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے (امن و عافیت کے) قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔۔۔ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو "هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ" (3:96) تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو "قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)" تمام نوعِ انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے' دنیا کا امن و سکون۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97) جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آ گیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

شمیم انور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟
(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

محترمہ صدرِ بزم۔۔خواتین وحضرات!

جب سے یہ سوال میرے سامنے آیا ہے کہ ''میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟'' میں سوچ رہی ہوں کہ کیا مجھے اس کا علم بھی ہے کہ ''زندہ رہنے'' سے مفہوم کیا ہے؟ کیا میں کبھی زندہ رہی بھی ہوں' کیا میں اب بھی زندہ ہوں؟ زندگی کے متعلق ایک تصور رکھنا اور بات ہے اور اس تصور کے مطابق زندگی بسر کرنا دوسری بات۔ قرآن کریم نے ہمیں زندگی کا ایک خاص تصور اور اسے ماپنے کا ایک پیمانہ دیا ہے جس کی رو سے' انسانی سطح زندگی اور اس سے نیچے کی مخلوق کی سطح حیات نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں اس کا تو علم ہے کہ قرآن کا عطا کردہ یہ تصور' اور یہ پیمانہ کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم کبھی اس تصور کے مطابق زندہ رہے ہیں اور کیا ہم نے کبھی اپنی زندگی کو اس پیمانے کے مطابق ماپا ہے؟ کیا ہم کبھی انسانی سطح زندگی کی کیفیات سے لذت یاب ہوئے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ کیفِ زندگی سے وہی لذت آشنا ہوسکتا ہے جس نے ان تصورات کے مطابق کبھی زندگی بسر کی ہو۔ اس کا چیلنج یہ ہے کہ

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

لہٰذا' خواتین وحضرات! یہ کہنے کا حق کہ ''میں زندہ ہوں'' صرف اسی کو ہوسکتا ہے جس نے کبھی زندگی کو محسوس کیا ہو۔ اور زندگی کو محسوس وہی کرسکتا ہے جس نے کبھی قرآنی تصور کے مطابق انسان کی سطح پر زندگی بسر کی ہو اور یہی وہ مقام ہے جہاں اصل دشواری پیش آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس سطح پر زندگی کے دن گزارنے کا کبھی تجربہ بھی ہوا ہے؟ اور اگر ایسا تجربہ نہیں ہوا تو پھر میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ ''میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' ''چاہنے'' کا سوال تو اس کے لئے پیدا ہوسکتا ہے جو جانتا ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

زندگی۔۔اقبال کے الفاظ میں۔۔نفس شماری کا نام نہیں' نفس گدازی کا نام ہے۔ جو نفس گدازی کی لذتوں سے کیف یاب ہی نہیں' اس کا یہ کہنا کہ ''میں زندہ رہنا چاہتا ہوں'' چند سنے سنائے الفاظ کے دہرا دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اسے کہنا چاہئے کہ میں سانس لیتے رہنا چاہتا ہوں۔

پھر خواتین وحضرات! اگر یہ نفس گدازی کی زندگی۔ اگر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کی کیفیات سے لذت گیری' کسی

ایک فرد کے بس کی بات ہوتی۔ اگر ہم اسے' باقی افرادِ معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر' اپنی خلوت کی تنہائیوں میں اپنے طور پر حاصل کر سکتے' تو بھی بات کچھ ایسی مشکل نہ ہوتی۔ جو اس ذوقِ بادہ سے لذت آشنا ہونا چاہتا وہ اپنے طور پر اس کے لئے کوشش کر لیتا' لیکن یہ ناممکن ہے۔ ہم دیگر افراد معاشرہ سے الگ رہ کر اس سے کیف اندوز ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم اکیلے بیٹھ کر رو تو سکتے ہیں۔۔ ہنس نہیں سکتے۔ اکیلے بیٹھا ہنسنے والا پاگل نظر آتا ہے۔

لیکن ہمارے موجود معاشرہ میں ہر فرد اکیلا زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں صرف افراد بستے ہیں' معاشرہ کا وجود ہی نہیں۔ یہاں ہر مسافر' کارواں سے کٹ کر' اپنے اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ یہاں ہر ایک کی راہ الگ اور ہر ایک کی منزل جدا ہے۔ ہم ان بستیوں میں بس رہے ہیں جہاں کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ ہم میں سے ہر ایک ''غریب شہر'' ہے۔ ہم ایک ایسی ٹیم ہیں جس کا ہر کھلاڑی مختلف سمتوں میں بال کو کک لگاتا ہے۔۔ وہ ٹیم جس کے سامنے کوئی مشترکہ گول نہیں۔ کوئی متحدہ نصب العین نہیں۔۔ ہمارے مفادات' ہماری اقدار' ہماری منزلیں۔۔ سب الگ الگ ہیں۔ ان کا کوئی نقطۂ اتصال ہی نہیں وہ کہیں جا کر ایک دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک' اس قدر انبوہِ کثیر کے اندر رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا اور تنہا محسوس کرتا ہے۔۔ ہم' رابنسن کروسو' کی طرح انسانوں کے ایک حدود فراموش سمندر کے اندر اپنے اپنے تصورات کے جزیروں میں تنہا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم جس دنیا میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں وہ ایک ایسا جیل خانہ ہے' جس کا ہر قیدی' اپنے اپنے ذہن و خیال کی کالی کوٹھڑی میں قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہا ہے۔ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

جب قرآن کریم ہمیں ایک مشترکہ منزلِ انسانیت کی طرف آواز دیتا ہے تو ہم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے شور و شغب میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ اس کی آواز ہمارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ ہم اسے یوں سنتے ہیں' جیسے وہ کسی اور کو بلا رہا ہو۔۔!

لیکن اس آواز نے ایک بار ہمارے دل کے تاروں کو ضرور چھوا ہے۔۔ ہم ایک بار زندگی کی کیف باریوں سے لذت یاب ضرور ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک بار ضرور محسوس کیا ہے کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندہ کہلانے کے مستحق کون ہیں۔۔ اور یہ کوئی دور کی بات نہیں ابھی کل کی بات ہے جب نور جہاں کی شعلہ صفت آواز میں ملی ترانے کا ایک بول' کروڑوں دلوں میں ارتعاش پیدا کر کے' انہیں یکسر ہم آہنگ کر دیتا' اور جوش نشاط کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا جس سے ہم اس سے پہلے کبھی لذت آشنا نہیں ہوئے تھے' یہ آرزو میرے دل کی گہرائیوں سے بار بار ابھرتی ہے کہ اے کاش! وہ دن کہیں پھر سے لوٹ آئیں! میری اس آرزو کے اظہار پر' کئی چہروں پر استہزاء کی ہنسی پھر جاتی ہے۔۔ شروع شروع میں' خود مجھے بھی اپنی یہ آرزو کچھ عجیب سی دکھائی دیا کرتی تھی۔۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا کہ چونکہ تم جنگ کی تباہ کاریوں سے براہ راست متاثر نہیں ہوئی ہو' اس لئے تم اس

انداز سے سوچتی ہو ورنہ جنگ بھی کوئی ایسا تماشا ہے جسے بار بار دیکھنے کی تمنا کی جا سکے؟ ایسا کہا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اب محسوس کرتی ہوں کہ میری یہ آرزو ان لمحات کو پھر سے واپس بلانے کے لئے ہے جن میں دس کروڑ نفوس کے دل کامل ہم آہنگی سے دھڑکتے تھے۔ جب ان کا ردعمل ایک تھا اور اس ردعمل کی شدت ایک جیسی تھی۔ جب وہ ایک آواز پر اٹھتے اور ایک آواز پر بیٹھتے تھے۔۔ جب وہ ایک مقصد کے لئے سوتے اور ایک مقصد کے لئے جاگتے تھے۔ نہیں! جب وہ ایک مقصد کے لئے جیتے اور ایک مقصد کے لئے مرتے تھے۔۔ اف! کس قدر نشاط انگیز تھی کروڑوں دلوں کی یہ ہم آہنگی۔۔ کیسی مسرت خیز تھی لاکھوں سازوں سے نکلنے والی یہ ایک صدا۔۔ کیسی وجد آور تھی یک نگہی و یک رنگی کے "بتھوون" کی یہ فردوسِ گوش (Symphony)۔۔ کیسے حسین تھے۔۔ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ۔۔ کے یہ سحر آفریں لمحات!

اب جبکہ وہ صدائیں فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گئی ہیں میں پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی' اور اداس محسوس کرتی ہوں۔۔ ایک میں ہی نہیں' ساری کی ساری قوم پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی اور اداس محسوس کرتی ہے' اس لئے کہ یہ پھر سے اپنی اس پہلی زندگی کی طرف لوٹ گئی ہے۔۔ وہی انفرادی مفاد پرستی اور خودغرضی کی زندگی۔۔ وہی ایک دوسرے سے ٹکرانے والی قدروں اور مختلف منزلوں کی طرف لے جانے والے راستوں کی زندگی۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ اس قسم کی یک نگہی اور ہم آہنگی کی زندگی' جنگ کے سے پُرخطر زمانے میں ایسی وجد آور اور طرب انگیز تھی' تو وہ حالتِ امن میں کیسی نشاط آور اور بہار آفریں ہوگی! اے کاش! مجھے وہ اندازِ ریست کہیں مستقل طور پر میسر آ جائے۔۔!

لیکن وہ مجھے تنہا کیسے میسر آ جائے؟۔۔ وہ تو اسی صورت میں میسر آ سکتا ہے جب' سب کے سب اس انداز کی زندگی بسر کریں اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔۔ ایک نے نوازا کیلا (Symphony) پیدا نہیں کر سکتا۔۔ اس مجبوری اور بے بسی کی بھی کوئی انتہا ہے؟ اب پھر وہی میں ہوں اور وہی شہرِ خموشاں!! ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے

اب جو یک نگہی اور ہم آہنگی کے وہ حیات بخش لمحات گذر چکے ہیں' معاشرہ میں پھر وہی نفسانفسی شروع ہو گئی ہے۔ اب پھر پہلے کی طرح' ہر سینے میں دل الگ الگ انداز سے دھڑکتا ہے۔۔ بالکل منفرد۔۔ باقی دلوں سے یکسر بیگانہ۔۔ اس کے مقاصد بھی الگ' ان کے حصول کے طریق بھی جداگانہ!

وہ مقصد ہے کیا جس کے لئے اب ہم مصروف تگ و تاز ہیں۔۔؟ ہمارے منصوبے' ہماری اسکیمیں' ہماری کوششیں' ہمارے خدشات' ہماری پریشانی کاہے کے لئے ہیں؟ ہماری تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ کیا ہے؟ ہماری تگ و تاز کی منزل کون سی ہے؟۔۔ اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ یہ سب' طبیعی زندگی کی ضروریات کے لئے وقف ہیں۔۔ روٹی' کپڑا'

مکان۔۔نفس شماری کی زندگی کے سہارے' حیوانی سطح پر جینے کا سامان۔۔اب ہماری تمام جدوجہد کا منتہٰی یہی ہے۔۔''اس وقت تو کھانے کو مل گیا ہے' کل کو کیا ہوگا'' اس کی فکر ہر ذہن کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ جو کوئی سوچتا ہے تو اسی کے لئے سوچتا ہے۔ جو کوئی کام کرتا ہے تو اسی کے لئے کرتا ہے۔ جو پریشان ہے وہ اسی کی وجہ سے پریشان ہے اور جو خوش ہے تو محض اس لئے کہ اسے یہ کچھ حاصل ہو گیا ہے! ہماری سیاسی' معاشی' معاشرتی زندگی کا سارا تانا بانا انہی خدشات اور انہی خطرات سے بُنا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو ہمیں کچھ ہو گیا تو ہمیں کھانے کو کہاں سے ملے گا۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ہم ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ جمع کر سکیں زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی کر سکیں۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیں۔۔دوسروں کے حقوق غصب کر لیں۔ ہم اسی جنون میں دوسروں کو اپنے پاؤں تلے روندتے چلے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ایک فرد دوسرے فرد کے قتل کے درپے ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی جان کا لیوا ہے۔ ایک مملکت دوسری مملکت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے۔۔کاہے کے لئے؟ صرف اس لئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس نسبت سے کوئی زیادہ سمیٹتا ہے اسی نسبت سے کوئی دوسرا اور زیادہ محتاج ہو جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ایک طرف وہ طبقہ بڑھتا جا رہا ہے جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھا ہے اور دوسری طرف اس انبوہِ کثیر میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو نانِ شبینہ تک کے لئے بھی ان کا محتاج ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود عدم تحفظ۔۔(Insecurity) کا احساس روز بروز شدید ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب' خواتین و حضرات! ہماری زندگی کا مقصد اور منتہٰی یہی رہ گیا ہے۔

زندہ رہنے کی اس مجنونانہ تگ و تاز سے ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بعض زندہ رہ جائیں۔۔خواہ وہ اس جنگ آزمائی سے کتنے ہی زخمی کیوں نہ ہو چکے ہوں۔۔لیکن سوال پھر وہی سامنے آتا ہے کہ اس جنون آمیز سعی و کاوش کا آخر مقصد کیا ہے؟ ہم کام کرتے ہیں' دن رات کام کرتے ہیں اور کام کرتے کرتے تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔۔اس سے ہمیں کیا ملتا ہے؟۔۔ محض روٹی! ہم پھر دوسرے دن اٹھ کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ کاہے کے لئے؟۔۔محض اس لئے کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے روٹی مل جائے۔۔ہم دن رات محنت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ ہماری یہ بے مقصد زندگی زیادہ سے زیادہ لمبی ہو جائے۔ ہماری یہ بے مقصدی مستقل ہو جائے۔

بارالٰہا! یہ زندگی کے ساتھ کیا مذاق ہو رہا ہے۔ یہ انسانیت کی کس قدر تذلیل ہے۔ ہماری تمام انسانی صلاحیتیں' استعداد' توانائی' وقت' عقل و خرد' سب روٹی حاصل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہم سے تو حیوانات ہی اچھے ہیں جنہیں اپنے زندہ رہنے کے لئے کبھی اس قسم کی دردسری نہیں کرنی پڑتی۔ یہ انسان جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے' اپنے غلط نظام زندگی کی بدولت' حیوانوں سے بھی پست تر سطح پر آ چکا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ مجھے' آپ کو اور ہر انسانی بچہ کو' اس کی ضروریات زندگی' بغیر جگر پاش مشقتوں کے' فطرت کے سیدھے سادھے طریق کے مطابق' از خود ملتی جائیں' اور جہاں اس میں کوئی رکاوٹ

پڑے، ہر فرد اسے بطور اپنے بنیادی حق کے طلب اور حاصل کر سکے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اور آپ کام کریں۔ زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ لیکن اس لئے کہ ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ ہم کام کرنے پر مجبور ہیں، اس ڈر کے مارے کہ اگر کام نہ کیا تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ محض روٹی کی خاطر زندہ رہنا، زندگی نہیں کہلا سکتا۔۔ زندگی یہ ہے کہ انسان، کام کرنے کے لئے خود اپنے آپ پر تو پابندیاں عائد کرے، کوئی دوسرا اس پر پابندی عائد نہ کرے۔ انسان اور حیوان میں یہی تو فرق ہے۔ حیوان دوسروں کی منشاء کے مطابق کام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے انسان اپنے اختیار و ارادہ سے کام کرتا ہے۔ سوچئے کہ اس کام میں کس قدر لذت اور حسن ہوگا جسے ہم بھوک کے اس بھیڑیئے کے خوف کی وجہ سے نہ کریں جو ہر وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے۔۔ لیکن ہم اس لذت کو کیا جانیں۔۔ اس لذت سے ہم میں سے کوئی بھی آشنا نہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اس بھیڑیئے کے خوف سے مامون نہیں۔۔ اگر انسان کو فکرِ معاش سے آزاد اور مطمئن کر دیا جائے تو اس کی جس قدر بے پناہ مضمر صلاحیتیں، بلند تخلیقی مقاصد کے لئے فارغ ہو جائیں گی ان کا آج اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک بلند مقصد کے لئے، دل کے پورے لگاؤ اور اطمینان کے ساتھ مصروفِ کار ہو جانے کے نتائج کس قدر درخشندہ ہوں گے اور اس سے خود کام کرنے والے کی صلاحیتوں کی کس قدر نشوونما ہوتی جائے گی۔۔ میں بحالاتِ موجودہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن بایں ہمہ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں لیکن صرف روٹی کی خاطر نہیں۔۔ میں کام کرنا چاہتی ہوں لیکن حصولِ معاش کے لئے نہیں۔۔ لیکن موجودہ معاشرہ میں اس کی فکر کس کو ہے کہ یہ دیکھتا پھرے کہ کون تخلیقی مقاصد کی خاطر کام کرتا یا کرنا چاہتا ہے جبکہ زندگی کا مقصد محض حفاظتِ خویش۔۔ (Self-Preservation) اور افزائشِ نسل (Procreation) رہ گیا ہو۔ جب مقصدِ حیات محض تولید رہ جائے تو تخلیق کا کسے خیال ہو سکتا ہے؟

(ماخوذ طلوع اسلام مئی 1966ء)

ضروری اطلاع

بزم طلوع اسلام (ڈی ایچ اے) کراچی نے کرونا وائرس کے پیش نظر اپنے ہفتہ واری دروس کو ONLINE کرنے کا فیصلہ کیا ہے لہٰذا تمام احباب سے گزارش ہے کہ تمام ویڈیو دروس اپنی ترتیب سے فیس بک اور یوٹیوب پر ہر ہفتے بروز اتوار صبح 10 بجے لائیو ہوں گے اور چینل پر ہمیشہ دستیاب رہیں گے یہ دروس مندرجہ ذیل لنکس پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

https://www.facebook.com/bazmetolueislamkhi/

https://www.youtube.com/deenequran

تمام دیکھنے والوں سے گزارش ہے کہ دونوں CHANNELS کو FOLLOW,LIKE اور SUBSCRIBE کرنا نہ بھولیں تاکہ خودکار سسٹم کے تحت دروس بروقت آپ تک پہنچتے رہیں۔ شکریہ

نمائندہ بزم طلوع اسلام ڈی ایچ اے کراچی

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 2)

اِنسانی ذات کی تخلیق اور اِس کے مقصد کے فہم کی تلاش

اللہ کی ذات کے اِدراک کا قرآنی تصور:

اللہ کا ذاتی نام ال اور الہ کا مرکب ہے۔ اس کی ذات کی کنہہ وحقیقت کا اِدراک عقل انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ قرآن سے بھی اِس کی تصدیق کی گئی ہے کہ ایسی بھی کچھ صفات ذات باری تعالےٰ کے ساتھ مختص ہیں اور اِن صِفات میں کوئی بھی اللہ کا اِدراک نہیں کرسکتا۔ قرآن میں ہے کہ:

هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ (57:3)

''وہی ہے سب سے پہلا، اور سب سے پچھلا، اور باہر اور اندر۔''

یہاں چار صِفات کا ذکر ہے:

(1) الاوّل، (2) الآخر، (3) الظاہر، (4) الباطن

اللہ تعالیٰ جہت زمان ومکان سے بلند وبالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا (الاول)۔

جب کچھ نہ ہوگا تو وہ موجود رہے گا (الاخر) ظاہر وباطن ہر جگہ موجود ہے۔

اِن کے علاوہ قرآن نے دو مزید اللہ کی ذات سے مختص صِفات کا ذکر کیا ہے کہ:

وَهُوَ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاکُمۡ ۫ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ؕ (22:66)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی۔ پھر وہ تمہیں مارے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔''

یہاں درج ذیل دو صِفات کا ذکر ہے۔

5، 6۔ احیاء (زندگی)، اماتت (موت)

موت اور حیات بھی اس کے ہاتھ میں ہے، جس میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا (25:3)

اور (اللہ کے علاوہ) موت وحیات اور دوبارہ اُٹھانے کی قوت کسی اور کے پاس نہیں ہے۔

عقل درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے محدود ذرائع علم ومشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا۔ اللہ اپنی ذات میں لامحدود ہے اور محدود، لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ذات خداوندی کی حقیقت و ماہیت سرحد ادراک سے ماورا ہے۔ (لیکن چند ملحدین کے سوا) خدا کی ذات کا کوئی منکر نہیں۔ ملحدین کا انکار بھی دراصل انکار نہیں، الفاظ کا پھیر ہے۔ وہ قوت جو نظم ونسق عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے ماننے والوں کے نزدیک خدا ہے اور نہ ماننے والوں کے نزدیک فطرت (NATURE)۔ نہ ان کا ذہن ذات خداوندی کی ماہیت کا احاطہ کر سکتا ہے نہ یہ فطرت کی حقیقت بتا سکتے ہیں۔ ذہن انسانی محسوسات کی حد تک علت ومعلول کے سلسلہ کو معلوم کر سکتا ہے لیکن علت العلل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

جن چیزوں سے خدا کا تصور ذہن میں مرتسم ہوتا ہے وہ اس کی صفات ہیں۔ یعنی خدا کن قوتوں کا مالک ہے، نظام کائنات میں اس کے قوانین کس کس انداز سے کارفرما ہوتے ہیں (وغیرہ وغیرہ)۔

صفات الٰہی:

صفات خداوندی کے صحیح تصور سے خدائے حقیقی کا صحیح ایمان قلب انسانی میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے غلط تعین سے انسان باطل پرست ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو اس شرح وبسط اور صحت وصواب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی رو سے انسان خدا کے متعلق صحیح تصور قائم کر سکتا ہے۔ مذاہب عالم میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو حتم ویقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس کی آسمانی کتاب تحریف والحاق سے پاکیزہ اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہے۔ حتم ویقین سے ایسا کہنا تو ایک طرف انہیں اس کا اعتراف واقرار ہے کہ ان کے بانی مذہب کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس موجود نہیں ہے۔

ہم نے اوپر کانٹ کے حوالہ سے کہا ہے کہ جس قسم کا خدا (یعنی صفات خداوندی) کا تصور ہمارے سامنے ہوگا اسی قسم کی ہماری (انفرادی اور اجتماعی) زندگی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا خدا کے تصور کے ساتھ بنیادی تعلق ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی خالص مادی پیکر (آب وگل) کی زندگی ہے جس کا مقصد (دیگر حیوانات کی طرح) تحفظ خویش (PRESERVATION OF SELF) اور تولید نسل (PROCREATION) ہے۔ یہ زندگی اس دنیا کی (طبیعی) زندگی ہے اور موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے مادی تصور حیات (MATERLALISTRIC CONCEPT OF LIFE) کہتے

ہیں۔لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی طبیعی (حیوانی) زندگی سے عبارت نہیں۔اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات (PRESONALITY) یا انسانی نفس (SELF) یا انا یا ایغو (EGO کہتے ہیں۔قرآن اسے ''روح خداوندی'' (الوہیاتی توانائی یا (DIVINE ENERGY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9)

خدا نے اپنی روح سے اُس میں پھونکا۔

اور اِسے ''نفس'' کہہ کر پکارتا ہے۔اِس کا تفصیلی ذکر آگے جا کر ایک پورے باب میں کیا گیا ہے۔مختصر طور پر بیان کیا جارہا ہے کہ انسانی جسم تو ہر آن بدلتا رہتا ہے لیکن انسانی ذات خارجی تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان اپنی طبعی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا اور حیات جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

صِفاتِ اِلٰہی کا اِنسانی ذات کی صِفات سے تعلق:

قرآن نے انسانی ذات کو ''روح خداوندی'' کی اصطلاح سے تعبیر کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اس نے کہا ہے کہ:

1۔خدا کی بھی ایک ذات (PERSONALITY) ہے اور انسان کی بھی ایک ذات ہے۔واضح رہے کہ انسان کی ذات خدا کی عطا کردہ ہے، ذات خداوندی کا جزو نہیں۔ذات ایک غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE UNITY) ہوتی ہے جو حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی اور جب انسانی ذات، ذات خداوندی کا جزو (یعنی حصہ) نہیں، تو (ویدانت یا تصوف کا) یہ عقیدہ کہ انسانی ذات، آخر الامر، ذات خداوندی، میں مدغم ہو جائے گی اور اس طرح جزو اپنے کل سے مل جائے گا (جس طرح قطرہ دریا سے مل جاتا ہے) قرآن کے خلاف ہے۔

2۔ذات (PERSONALITY) جہاں بھی ہوگی اس کے بنیادی خصائص (BASIC CHARACTERISTICS) ایک ہی ہوں گے۔

3۔خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لیے اس کے خصائص وصفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔قرآن انہیں اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔یہ اس ذات کے مختلف شئون یا "FACETS" ہیں۔

4۔انسانی ذات ایک سمٹی ہوئی شکل میں اور (ذات خداوندی کے مقابلہ میں) محدود ہے، اس لیے اس کی صفات بھی (خدا کی صفات کے مقابلہ میں) محدود ہیں۔لیکن بایں ہمہ، اس میں (محدود طور پر) وہ تمام صفات موجود ہیں جنہیں (خدا کے سلسلہ میں) اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔بجز ان صفات کے جو خدا کی لامحدودیت سے متعلق ہیں (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)۔

5۔خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکنات زندگی

(REALISABLE POSSIBILITIES) یا مضمر (LATENT) یا مستتر (POTENT) یا خوابیدہ (DORMANT) شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کا مشہود (MANIFEST) یا بارز (ACTUALISE) کرنا انسانی زندگی کا مقصود ہے، اسی کو انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) کہتے ہیں۔

6۔ ظاہر ہے کہ ایک نچلی (LOWER) سطح کی ذات کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لیے کسی بلند (HIGHER) ذات کو بطور معیار (STANDARD) اپنے سامنے رکھے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کا معیار نہ ہو تو وہ کبھی یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو ہی نہ رہی ہو اور وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو کہ اس کی نشوونما (تزکیہ نفس) ہو رہی ہے لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کے لیے صفات خداوندی کو بطور معیار اپنے سامنے رکھے۔

قرآن نے صفات خداوندی کو اس تفصیل و وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ اسی لیے بیان کیا ہے کہ انسان کے لیے ان کے معیار بننے میں کسی قسم کا شک وشبہ یا ابہام والتباس نہ رہے، جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ (قرآن کے الفاظ میں) ''خدا کے رنگ میں رنگا جاتا'' یا اس کا ''قرب'' حاصل کرتا جاتا ہے۔

7۔ انسانی ذات میں ان صفات کی نمود کچھ ایسی شے نہیں جس کے متعلق کسی دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے اور پوچھنے والے سے یہ کہہ دیا جائے کہ۔

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

ان صفات کا اظہار انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آجاتا ہے، اسی کو انسان کا کریکٹر کہتے ہیں۔ یاد رکھئے، قرآن کریم کی رو سے بلندی اخلاق (کریکٹر) ہی معراج انسانیت ہے۔ اس کے سوا ''روحانیت'' کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن کریم میں تو ''روحانیت'' کا لفظ تک نہیں آیا۔ خود حضور نبی کریم ﷺ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (68:4)

آپ ''خلق عظیم یعنی بلند ترین کریکٹر کے حامل تھے۔

8۔ خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

9۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے انسانی ذات، ہر انسان کو خدا کی طرف سے ملتی ہے لیکن ملتی ہے غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ انسان کا جو عمل، قرآنی پروگرام کے مطابق ہوگا اس سے انسانی ذات کا استحکام ہوگا۔ جو اس کے خلاف ہوگا اس سے اس میں ضعف و اضمحلال واقع ہوگا (اسے قانون مکافات عمل کہتے ہیں)۔ ان اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی لہٰذا انسانی ذات پر ایمان کے معنی خدا پر ایمان، اس کے قانون مکافات عمل پر ایمان اور

حیات آخرت پر ایمان کے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا اور انسان کا بنیادی تعلق کیا ہے اور اس لیے صفات خداوندی کا اپنی حقیقی اور بلا آمیزش شکل میں سامنے ہونا کس قدر ضروری۔ خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ انسان کا اپنی ذات کے وجود پر ایمان ہے جو اسے حیوانی سطح کی زندگی سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ مغرب کے مادی (میکانکی) تصور حیات اور قرآنی تصور زندگی کا یہ بنیادی فرق ہے اور اسی فرق سے دونوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ راستے بھی مختلف اور منزلیں بھی مختلف۔ اسے پھر سن لیجئے کہ جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔

سورہ اخلاص میں دی گئی اللہ کی بنیادی صِفات سے قُرب میں اِنسانی ذات کی نشوؤنماء کا موقف:

قرآن کی سورہ اخلاص میں اللہ کی ذات کی بنیادی صِفات کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (112:1-4)

”تو کہہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا، اور نہ وہ کسی سے جنا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی ہے۔“

اس سورہ میں ذاتِ خداوندی کی چار اساسی بنیادی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ انسانی ذات بھی چونکہ بحدِ بشریت خدا کی صفات سے قُرب کے حصول کو اپنی ذات میں منعکس کرنے کی استعداد رکھتی ہے، لہٰذا، اگر خدا کی صفات کو انسان حدِ بشریت اپنے اندر جس قدر منعکس کر لے، تو اُسی قدر وہ اللہ کے رنگ میں رنگا جائے گا۔

1۔ اللہ کی ذات کی پہلی صفت احد:

احدیت، ایک بڑی جامع اصطلاح ہے، جس کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تفرید (Uniqueness)، توحید (One ness) اور وحدت و جامعیّت (wholeness) کے تمام رشتے آجاتے ہیں۔ اس صفتِ تفرید میں کسی اور شے کی آمیزش کا شائبہ نہیں ہوتا۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں:

گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یہی اللہ کی ذات کی بنیادی مُطلق خصوصیت بتائی گئی ہے اور اِنسانی ذات میں بشری حد تک منعکس ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

2۔ اللہ کی ذات کی دوسری صفت صمد:

یہ بھی ایک جامع لفظ ہے، جس کا مفہوم ہے خارجی سہاروں سے مستغنی ہونا، اپنے ارادوں کا مالک آپ ہونا، اپنے فیصلوں میں خود مختار ہونا۔ اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بھی بنیادی خصوصیت ہے، جس کے تحت کئے گئے اعمال اُسی کے تخلیقی اعمال کہلاتے ہیں، جن کا وہ جوابدہ ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہے اور نہ مجبوری کی بدی، بدی ہے۔ واضح رہے کہ ذات کا اپنی مرضی سے اپنے اوپر پابندی عائد کر لینا، اس کی آزادی کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ تو ذات کے

اختیار وارادہ کا مظہر ہے۔ آزادی کے منافی وہ پابندی ہے، جسے کوئی دوسرا اس کی مرضی کے خلاف عائد کرے۔ اپنے اوپر پابندیاں خود ذاتِ خداوندی نے بھی عائد کر رکھی ہیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (6:54)

''تمہارے رب نے رحمت (اور ربوبیت) کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے۔''

انسان بھی اپنی ذات کی نشوونما کے لیے، جو پابندیاں بطیبِ خاطر خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے، وہ اس کی مجبوری کا اظہار نہیں کرتی اور شرفِ انسانیت کے منافی نہیں کہلائی جاسکتیں۔

3۔ اللہ کی ذات کی تیسری صفت لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ:

یہ بھی اللہ کی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ انسانی جسم بسلسلہ تولید (Procreation) پیدا ہوتا ہے۔ یہ ''پیدائش'' کی حیوانی سطح ہے۔ اس سے ایک فرد اپنے باپ کی اولاد بنتا ہے، اور پھر اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات، پیدائش کے اس سلسلہ کا نتیجہ نہیں۔ پیدائش بسلسلہ توالد وتناسل میں مرد کا ایک حصہ اس سے الگ ہو کر بیٹے کے جسم کا جزو بنتا ہے۔ لیکن ذات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں ہوسکتے۔ اگر ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ ہو جائے تو ذات نامکمل رہ جاتی ہے، اور ذات کا نامکمل ہونا ذات کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔ خدا کی اولاد کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، چونکہ انسان اپنے ذہن اپنے ذہن کے پیدا کردہ خدا کو اپنی شکل پر تراشتا تھا، اس لیے اسکے اندر تمام انسانی خصوصیتیں جمع کر دیتا تھا۔ اولاد، انسان کے نزدیک سب سے بڑی نعمت اور بہت بڑا سہارا ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے ''خدا'' کو اس سے کیوں محروم رکھتا؟ یوں بھی جب وہ دیکھتا کہ سلسلہ پیدائش، تولید وتناسل کے ذریعہ سے ہی قائم ہے تو یہ چیز اس کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ کوئی ہستی خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو اس سے منزہ ہوسکتی ہے۔

خدا کی بیوی کا عقیدہ:

مجوسیوں کے ہاں سب سے قدیم دیوتا (MITHRA) خدائے ہرمزد کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ یہی عقیدہ بقول (CLEMENT WOOD) اور ڈاکٹر براؤن، روم میں پہنچ کر ابنیت مسیحؑ کے عقیدہ کا باعث بنا۔ ہندوؤں کے ہاں اولاد کے علاوہ دیوتاؤں کی بیویاں بھی تصور کی جاتی ہیں۔ شیو جی کی بیوی پاربتی اور ان کا بیٹا گنیش ہے۔ برہما، جو سب سے بڑا خدا ہے، اس کی بیٹی سرسوتی ہے۔

4۔ اللہ کی ذات کی چوتھی صفت كُفُوًا:

اللہ کی یہی صفت جس قدر فرد یا قوم کے افراد کی ذات میں کارفرما ہوتی ہے، اُسی قدر انسانی ذات کی نشوونماء کا باعث ہو رہی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی فرد یا قوم اس کی ہمسر نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم نے ایسی ہی جماعتِ مومنین کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقویٰ کا دینی مفہوم

تذکرۃ الاولیاء حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مشہور و مستند کتاب ہے جس میں شیخ موصوف نے تقریباً ایک سو مشہور و معروف اولیاء اللہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کئے ہیں۔ اور اُن کے حالات زندگی میں ان کے تقویٰ، طہارت، خشیتِ الٰہی اور پرہیزگاری کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سب حضرات کے نظریات وعقائد واعمال اور زندگی کے معمولات تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ ان برگزیدہ حضرات کے حالات میں سے صرف چند واقعات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت سفیان ثوری کے مناقب میں تحریر ہے ''آپ پیدائشی متقی تھے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ کی والدہ نے ایام حمل میں ہمسایہ کی کوئی چیز بلا اجازت منہ میں رکھ لی تو آپ نے پیٹ میں تڑپنا شروع کر دیا اور جب تک اُنہوں نے ہمسایہ سے معذرت طلب نہیں کر لی، آپ کا اضطرار ختم نہیں ہوا۔ اور آپ کے تائب ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے الٹا پاؤں مسجد میں رکھ دیا جس کے بعد نداء آئی کہ اے ثوری سجدہ حق میں یہ گستاخی! پس اُسی دن سے آپ کا نام ثوری پڑ گیا۔ بہرحال یہ ندا سن کے خوف کا ایسا غلبہ ہوا کہ غش کھا کر گر پڑے اور ہوش آنے کے بعد اپنے پر طمانچے لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ بے ادبی کی ایسی سزا ملی کہ میرا نام دفتر انسانیت سے خارج کر دیا گیا''۔ (صفحہ:158)

حضرت حسین منصور کے مناقب میں تحریر ہے ''ہر رات آپ چار سو رکعتیں نمازیں ادا کیا کرتے تھے اور اِس فعل کو اپنے اوپر فرض قرار دے لیا تھا اور جب لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ ایسے بلند مراتب کے بعد آپ اذیتیں کیوں برداشت کرتے ہیں آپ نے جواب دیا کہ مصائب پر صبر کیا جائے اور اس کی راہ میں فنا ہو جانے میں راحت وغم کا کوئی احساس نہیں رہتا''۔ (صفحہ:353)

حضرت احمد حصرویہ کے مناقب میں تحریر ہے ''رات میں آپ کے ہاں چور آ گیا لیکن جب خالی ہاتھ جانے لگا تو آپ نے فرمایا میرے ساتھ رات بھر عبادت کرو اور اِس کا جو صلہ مجھے ملے گا وہ میں تمہیں عطا کر دوں گا۔ چنانچہ وہ رات بھر آپ کے ہمراہ مشغولِ عبادت رہا اور صبح کو جب کسی دولت مند نے بطور نذرانہ سو دینار بھیجے تو آپ نے اس چور کو دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو صرف ایک شب کی عبادت کا معاوضہ ہے۔ یہ سن کر اس چور نے کہا کہ صد حیف میں نے آج تک اس خدا کو فراموش کئے رکھا جس کی ایک رات عبادت کرنے کا یہ صلہ ملتا ہے۔ پھر وہ توبہ کر کے آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہو گیا، اور

بہت بلند مراتب حاصل کئے''۔(صفحہ:233)

حضرت ابوالحسن فرقانی کے حالات میں تحریر ہے'' چالیس سال تک کبھی آپ نے ایک لمحہ کے لئے بھی آرام نہیں کیا اور عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے رہے' چالیس سال کے بعد ایک دن مریدوں سے فرمایا کہ مجھے تکیہ دے دو میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مریدوں کو اس پر بہت حیرت ہوئی اور پوچھا کہ آپ آج آرام کے خواہاں کیوں ہوئے۔ فرمایا کہ آج میں نے خدا کی بے نیازی اور استغنا کا مشاہدہ کرلیا۔ حتیٰ کہ تیس سال تک اللہ تعالیٰ کے خوف کے سوا میرے قلب میں کوئی خیال پیدا نہیں ہوا۔''

آپ اتقیاء واولیاء کے حالات ومناقب کی کتب ملاحظہ فرماتے جائیں۔ آپ کو ان حضرات کے اوصاف میں یہی چیزیں ملتی چلی جائیں گی۔ اور تقویٰ' پرہیزگاری کا یہ تصور (Concept) سب کے ہاں مشترک پایا جائے گا۔ جبکہ قرآن کریم کے مطابق تقویٰ کے متعلق یہ چند امور بالکل واضح ہیں کہ:

(1) تقویٰ کا کوئی تعلق پرستش سے نہیں ہے۔ کیونکہ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

(2) تقویٰ انفرادی طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ تقویٰ اجتماعی زندگی میں حاصل ہوتا ہے۔

(3) مذہب میں گناہ سے بچنے کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ امام راغب نے اپنی مفردات میں تحریر کیا ہے'' اور اصطلاحِ شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا موجب ہو''۔(جلد: دوم صفحہ:1135)۔ تفسیر ضیاء الدین میں تحریر ہے'' عرف شرع میں تقویٰ کہتے ہیں ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانا''(جلد:1 ص:30)

لیکن یہ بات واضح رہے مسلمانوں میں گناہ کا تصور عیسائیت سے آیا ہے۔ مذہب میں گناہ ہوتا ہے۔ دین میں گناہ نہیں ہوتا بلکہ دین میں خلافِ قرآن کاموں کو جرم کہا جاتا ہے۔ دین میں جرم اور گناہ Sin اور Crime ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں چونکہ دین کا تصور کبھی آیا ہی نہیں' اس لئے مذہب اور پرستش کی بھی کوئی واضح تعریف کبھی نہیں کی گئی۔ طلوع اسلام تحریک ہے جو اقامتِ دین کی داعی ہے۔ نوح علیہ السلام سے لے کر' رسول ﷺ تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام دین کے داعی رہے تھے۔ حضور ﷺ کے بعد سے کوئی شخص بھی دین کا داعی نہیں ہوا۔ تاریخ انسانیت میں تحریکِ طلوع اسلام پہلی تحریک ہے کہ جو قرآن کی راہنمائی میں اقامتِ دین کی دعوت لے کر اٹھی ہے۔ اِس بات سے اِس تحریک اور اس تحریک کے بانی کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور اسی تحریک نے عبادت اور پرستش کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے۔ اِس تحریک کے نزدیک اسلامی نظام کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہے۔ اور ہر وہ کام جس میں اسلامی نظام کو نظر انداز کر کے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کیا جائے وہ پرستش کے زمرہ میں آتا ہے۔ جو تاجر حضرات اپنی تجارت سے غریبوں کا خون چوس کر رمضان میں غریبوں کے روزے افطار کراتے ہیں یہ پرستش کی واضح مثال قائم کرتے ہیں۔ غریبوں کی دولت ہتھیا کر' عمرے کرنا یا مزاروں پر جانا' پیروں' فقیروں' مریدوں کے نام پر رسوم پر خرچ کرنا' تہجد گزاری' نوافل' تسبیح وتہلیل برلب پرستش میں

شامل ہیں۔اور اس کا تقویٰ سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تقویٰ قرآن کریم کی ایک اہم ترین اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم کسی ایک آیت سے واضح نہیں ہوسکتا۔جن آیات میں تقویٰ یا اس کے مادہ وق ی اور وقایۃ سے مشتق الفاظ آئے ہیں۔ان کو باہم ربط کے ساتھ یک جا کر کے اس پر غور وتدبر کرنے کے بعد اس کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔وقایۃ کے لفظی معنی تکلیف دہ چیزوں سے بچنا ہے' قرآن کریم میں ارشاد عالیٰ ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ (5:2) اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی میں باہم کسی کی مدد نہ کرو۔اس جگہ تقویٰ کا روایتی ترجمہ پرہیزگاری کیا گیا ہے۔لیکن قرآن کریم نے تقویٰ کو عدوان کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔اور عدوان کے واضح معنے سرکشی کے ہیں لہٰذا تقویٰ کے معنے قرآنی قوانین کی اطاعت کے ہیں۔پھر اطاعت کے اس مفہوم کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ (3:102) اے ایمان والو اللہ سے خوب ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمام عمر قوانین خداوندی کے آگے جھکے رہو۔اس آیت کے آخری حصہ ''اور تمام عمر اللہ کے قوانین کی اطاعت کرتے رہو'' نے تقویٰ کے لفظ کی خوب وضاحت کردی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ (26:91-90) اور بہشت پرہیزگاروں کے سامنے کردی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے ظاہر کردی جائے گی۔اس آیۂ مجیدہ میں متقین اور غاوین کو ایک دوسرے کی اضداد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔غاوی وہ شخص ہوتا ہے جو بوجہ اپنی غوایت کے دوسری راہیں تلاش کرتا ہے۔لہٰذا متقی وہ شخص ہے جو قوانینِ اساسی کی کامل اطاعت کرتا ہے۔

متقی کے لغوی معنے کامل اطاعت کرنے والا' معلوم ہونے کے بعد آپ وہ آیات کریمات ملاحظہ فرمائیں' جو تقویٰ کا مفہوم واضح کرتی ہیں۔

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ (33:71-70) اے ایمان والو خدا سے ڈرتے رہو اور ہمیشہ درست بات کیا کرو تو خدا تمہاری کارگزاریوں کو درست کردے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا' اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی وہ اپنی مراد کو خوب اچھی طرح پہنچ گیا۔اس آیۂ کریمہ نے درست بات کرنے کو تقویٰ قرار دیا ہے اور آیت کے آخری حصہ نے واضح کردیا کہ اللہ ورسول کی اطاعت ہی تقویٰ ہے۔

(2) ارشاد عالی ہے: اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (9:119)' ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔یہاں صادقین کی معیت کو تقویٰ کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔کیونکہ قوانین خداوندی کا اتباع بغیر نظام کی موجودگی کے ہو ہی نہیں سکتا۔اور اجتماعی احکامات میں ان کا نفاذ واجراء نظام ہی کرسکتا ہے۔یہ اطاعت انفرادی طور پر ہو ہی

نہیں سکتی۔ ہم آج کل مجبور ہیں کہ سود کھائیں۔ غیر اسلامی نظام میں سود سے اجتناب کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے تقویٰ کے لئے شرط ہے کہ سچوں کی معیت اختیار کی جائے۔

(3) ارشاد ہوتا ہے: فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (2:283) تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اِس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے جو اِس کا رب ہے ڈرا کرے' یہاں امانت کی ادائیگی کو تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

(4) ارشاد عالی ہے: بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (3:76) کیوں نہیں' جو کوئی اپنا عہد پورا کرے' اور وہ پرہیز گار رہے' تو اللہ پرہیز گاروں سے محبت کرتا ہے۔ اِس جگہ عہد پورا کرنے کو تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

(5) ارشاد ہوتا ہے: وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا (2:282) جس پر حق عائد ہوتا ہے وہ دستاویز لکھوائے' اور وہ اللہ جو اس کا رب ہے' اُس سے ڈرے اور اس میں سے کچھ کم نہ کرے۔ یہاں یہ حکم ہوا ہے کہ کاتب کو چاہیئے کہ بلا انکار کئے جس طرح شرع کا حکم ہوا ہے وہ دستاویز تحریر کردے اور اِس دستاویز کو تحریر کرنے میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرے۔ قرض کی رقم کی دستاویز تحریر کرنی' اور اس دستاویز میں رقم کی کمی بیشی نہ کرنی' کو تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

(6) ارشاد عالی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا (2:278) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سود سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو' یعنی سود کی حرمت و ممانعت سے پیشتر جو سود لے چکے ہو' وہ تو خیر لے ہی لیا' لیکن ممانعت کے بعد جو سابقہ سود تھا اس کو بھی ہرگز نہ مانگو۔ یہاں سابقہ سود کو چھوڑ دینے کو تقویٰ کہا گیا ہے۔

(7) وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (3:50) اور تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ یعنی جب میری صداقت کے نشان دیکھ لیے ہیں تو اب تمہیں خدا سے ڈر کر میری اطاعت کرنی چاہیئے۔ یہاں حضرت عیسیٰ کی اطاعت کو اللہ سے تقویٰ قرار دیا گیا ہے' رسول یا نبی کی اطاعت ہی تقویٰ ہے۔

(8) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (3:130) اے ایمان والو، دونے پر دونا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تمہارا بھلا ہو۔ یعنی سود کھانے میں بھلا نہیں ہے بلکہ تمہارا بھلا اس میں ہے کہ خدا سے ڈرو۔ سود کھانا چھوڑ دو۔ یہاں سود نہ کھانے کو تقویٰ گردانا گیا ہے۔

(9) ارشاد عالی ہے: إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (26:162-163) میں تمہارے لئے پیغام لانے والا ہوں' اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ انبیاء کرام کا یہ قولِ مبارک کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔ تقریباً تمام انبیاء کرام نے یہی کہا کہ اللہ سے ڈرو اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ میری اطاعت کرو۔ انبیاء کرام کی اطاعت ہی تقویٰ ہوتا ہے۔

(10) فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا (64:16) جہاں تک بھی ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور اطاعت کرو۔ یہاں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو سننا' اور اِس پر عمل کرنا تقویٰ قرار دیا گیا ہے۔

(11) وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (4:129) اور اگر اصلاح کرتے رہو اور اُس سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی اگر اپنی بیویوں کے بارے میں اصلاح و مصالحت کا معاملہ کرو گے اور تعدی اور حق تلفی سے بچے رہو گے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ اس جگہ اپنی ازواج سے مصالحت معاملات کو تقویٰ کہا گیا ہے۔

(12) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (49:10) مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، بس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جاوے۔ جب دو بھائی آپس میں ٹکرا جائیں تو ان کو ان کے حال پر یوں ہی نہ چھوڑ دو بلکہ اصلاح کی پوری کوشش کرو، اپنے دو بھائیوں کی آپس میں صلح کرانا تقویٰ ہے۔

(13) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:179) اور تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل مندو تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ معاشرہ کے لئے یہ حکم کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سستی، جانبداری یا چشم پوشی سے کام نہ لیں۔ جو کسی کو قتل کرتا ہے وہ صرف اسی کو قتل نہیں کرتا۔ بلکہ پوری انسانیت کو قتل کر دیتا ہے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ قصاص لے کر معاشرہ میں امن قائم کریں اور اس طرح یہ ایک ضمانت بھی ہوگی کہ آئندہ قتل کی واردات میں کمی واقع ہو۔

(14) ارشاد ہوتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (5:8) اور کسی قوم کی دشمنی انصاف چھوڑنے کا باعث نہ بنے، عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے قریب ہے، کسی قوم کی دشمنی کے باوجود اس سے عدل قائم رکھنا تقویٰ ہے۔

(15) ارشاد ہوتا ہے: وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (29:16) اور ابراہیم کہ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا، بندگی کرو اور ڈرتے رہو اس سے یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔ اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی محکومیت اور تقویٰ کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اسلامی نظام کی اطاعت ہی تقویٰ ہے۔

(16) اس بارے میں ایک بڑی جامع آیت یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ (71:3) اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اس سے تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

اِن آخری دو آیات نے بات بالکل واضح کر دی ہے اللہ تعالیٰ کی محکومیت اختیار کرو، اللہ سے تقویٰ اختیار کرو، اور میری اطاعت کرو۔ اس کی پہلی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کرو جس میں عملاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہو، اس نظام میں، اس نظام کے قوانین کی نافرمانی کر کے، غلط برے اور تخریبی نتائج و اثرات سے بچو اور اس نظام کی فائنل اتھارٹی کی پوری پوری اطاعت کرو۔ چونکہ انبیاء کرام ہی ایسا انقلاب برپا کرتے تھے، اس لئے جب تک وہ رسول زندہ رہتا تھا، وہ خود اس نظام کی فائنل اتھارٹی ہوتا تھا۔ رسول کے انتقال کے بعد یہ اتھارٹی اس کے جانشین کی طرف منتقل ہو جاتی تھی، اور اس جانشینِ رسول کی بھی اطاعت عبادتِ خداوندی ہو جاتی تھی۔ ہمارے اِس موجودہ دور میں چونکہ نبوت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ اس لئے ایسا

کرنا ہم مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں صرف اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کا عملاً نفاذ ہو' اس نظام کے قوانین کی نافرمانی کے برے نتائج سے بچیں اور جو فائنل اتھارٹی اس دور میں جو قوانین جاری کر رہی ہو' ان قوانین کی اس طرح اطاعت کریں کہ: لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65) اپنے دل میں بھی کوئی تنگی و گرانی محسوس نہ کریں۔ اور بخوشی ان احکامات کی اطاعت کریں پھر آپ ملاحظہ فرمائیں کہ وہ نظام کس طرح جنت بداماں ہوتا ہے۔

آپ کی خدمتِ عالی میں سولہ آیات کریمات پیش کی گئی ہیں جن میں تقویٰ کے دینی مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ قارئین کرام خود غور فرمائیں کہ تقویٰ کے اس مفہوم میں پرستش کا کوئی دخل ہو سکتا ہے؟ ہم نے تقویٰ کے ان عناصر کو تو ترک کر دیا ہے جن سے معاشرہ پر تعمیری اثرات پڑتے تھے' اور جن سے اقوام زندہ رہتی ہیں' لیکن ان اجزاء کو چھوڑ کر صرف پرستش کے پیچھے لگ گئے' جس نے مسلمانوں کو اِس حال تک پہنچا دیا ہے۔

اب تقویٰ کی عملی مثالیں اس لئے پیش خدمتِ عالی کی جاتی ہیں تا کہ ان سے مفہوم مزید واضح ہو جائے۔ اور تقویٰ کا جو ربط ہمارے معاشرہ کے ساتھ عملی طور پر ہے وہ پیشِ نگاہ آ جائے۔

(1) قرآنِ کریم میں حکم ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ (2:188) تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور اس کو حکام دہی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یعنی ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال نہ کھاؤ۔ اسی میں دھوکا' جوا' سٹہ' زبردستی مال چھین لینا' کسی کے حقوق کا انکار اور وہ مال جسے اس کے مالک نے خوشی سے نہیں دیا سب آج کل باطل میں شامل ہیں۔ ہمارا لین دین اگر قرآن کریم کے اس حکم کے مطابق ہو جائے تو کئی مقدمہ بازیاں ختم ہو جائیں۔ باطل مال کھانے سے باہمی محبت دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہمارے سارے معاشرے میں کرپشن ناسور کی طرح پھیلی ہوئی ہے' کرپشن یعنی باطل مال کھانے کے غلط نتائج سے بچنا تقویٰ ہے۔ ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ جو لوگ پرستش کرنے میں پیش پیش ہیں اور حد درجہ شریعت کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں' لیکن اس کے باوجود وہ باطل مال کھانے سے اجتناب نہیں کرتے۔

(2) قرآن کریم کا حکم ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (6:132) ہر ایک کے لئے ان کے عمل کے مطابق درجات ہیں اور تیرا رب ان کے کام سے بے خبر نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں معارف القرآن میں تحریر ہے کہ ''جب رسول آ گئے اور اطلاع ہو گئی پھر جیسا کوئی کرے گا' ہر ایک کے لئے' جن وانس صالح وطلاح میں سے جزا و سزا کے ویسے ہی درجے ملیں گے۔ ان کے اعمال کے سبب اور آپ کا رَب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں''۔ اس آیت کی اس روایتی تفسیر نے اس آیت کا تعلق اس دنیا سے بالکل منقطع کر دیا اور اس کو آخرت سے وابستہ کر دیا۔ حالانکہ اس آیت کا تعلق اس عملی دنیا سے ہے۔ ہمارے معاشرہ میں بھی یہ اصول کارفرما ہونا چاہئے کہ جو اپنی استطاعت کے مطابق کام کر رہا ہے

اس کو وہی درجہ ملنا چاہئے لیکن ہمارے معاشرہ میں یہ نہیں ہو رہا ہے۔ نااہل لوگوں کو وہ درجات اور عہدے دیئے جا رہے ہیں جن کے وہ بالکل اہل نہیں ہیں۔ اور اس سے معاشرے میں بڑے برے اثرات پیدا ہو رہے ہیں' کیونکہ قرآن کے حکم کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ ان تباہ کن اثرات سے محفوظ رہنا تقویٰ ہے۔

(3) قرآنِ کریم نے فرقہ بندی اور سیاسی پارٹیاں بنانا شرک قرار دیا ہے (6:159؛30:31-32) کیونکہ جب امت فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے' تو دین باقی نہیں رہتا۔ نہ اسلامی مملکت وجود میں آسکتی ہے۔ فرقہ بندی کرنا' اور سیاسی پارٹیاں بنانے کے جو غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں' ان سے بچنا تقویٰ ہے۔

(4) ارشاد ہوتا ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8) کوئی قوم اگر تم سے دشمنی کرتی ہے تو یہ بات تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ اس کی طرف سے دشمنی کے باوجود اس کے ساتھ عدل کرو کیونکہ عدل تقویٰ سے قریب ہے۔ دشمن قوم سے بھی عدل کرنا لازمی ہے۔ اور عدل نہ کرنے کے غلط اثرات بہت سے برآمد ہو سکتے ہیں۔ ان غلط نتائج و اثرات سے بچنا تقویٰ ہے۔

(5) ارشاد عالی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (24:27) اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ چلے جایا کرو' یہاں تک کہ ان سے اجازت لے لو۔ اور ان گھروں کے رہنے والوں سے مناسب سلامت کر لو' یہی تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ حواشیٔ عثمانی میں تحریر ہے "اندر جانے سے پہلے آواز دے کر اجازت حاصل کرے اور اس سے بہتر آواز سلام کی ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین مرتبہ سلام کرے اور اجازت داخل ہونے کی لے۔ اگر تین بار سلام کرنے کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے۔ فی الحقیقت یہ ایسی حکیمانہ تعلیم ہے کہ اگر اس کی پابندی کی جائے تو صاحبِ خانہ اور ملاقاتی دونوں کے حق میں بہتر ہے مگر افسوس آج مسلمان ان مفید ہدایات کو ترک کرتے جاتے ہیں جن کو دوسری قومیں ان سے ہی سیکھ کر ترقی کر رہی ہیں"۔

حضرت اقدس نے اس حکم کی جو تعریف فرمائی ہے وہ صد فیصد درست ہے۔ لیکن ہم یہ اضافہ کرنا بہت ضروری سمجھتے ہیں' جو حضرتِ اقدس نظر انداز کر گئے ہیں کہ تحریکِ طلوعِ اسلام کے نزدیک' قرآنِ کریم کے ہر حکم کی اطاعت عبادت خداوندی ہے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ اس حکم کو نظر انداز نہ کرے' کیونکہ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل ہونے سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں' ان قباحتوں سے بچنا تقویٰ ہے۔

(6) ارشاد باری تعالیٰ ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ (2:282) ایمان والو جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کرو کسی مقررہ وقت تک کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔ جب آپ اس حکم کی تعمیل فرمائیں گے اور ادھار دیتے یا لیتے وقت' اس کو ضبطِ تحریر میں لے آئیں گے' تو آپ اللہ کی عبادت کریں گے' جب اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی اطاعت سے اس کی عبادت ہوتی چلی جاتی ہے' تو پھر پرستش کی گنجائش کس جگہ رہ جاتی ہے۔ پھر اگر

کوئی شخص اس معاہدہ کو اس لئے تحریر میں لا رہا ہے کہ اُسے ڈر ہے کہ کوئی پارٹی معاہدہ سے منحرف نہ ہو جائے' تو اس کے انحراف کے غلط نتائج سے بچنا تقویٰ ہے۔

(7) ارشاد عالی ہے: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (2:233) اور بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ جو ماں اپنے بچہ کو دو سال دودھ پلاتی ہے وہ اللہ کی عبادت کرتی ہے۔ اسے یہ خطرہ ہوگا کہ اگر میں بچہ کو دو سال تک دودھ نہیں پلاؤں گی تو یہ کمزور ہو جائے گا یا بیمار ہو جائے گا۔ دودھ نہ پلانے کے جو اثرات بچہ پر وارد ہو سکتے ہیں' ان سے بچنا تقویٰ ہے۔

(8) ارشاد عالی ہے: وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۔ (49:11) آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو' نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ جو شخص ان دونوں احکامات کی اطاعت کرتا ہے' وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اور اس حکم کی نافرمانی کے غلط اثرات سے بچے گا' اور اس بچنے کا نام تقویٰ ہے۔

(9) ایک شخص دفتر میں ملازم ہے۔ اسلامی نظام میں جو شخص' نظام کی اطاعت کرتا ہے' وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اگر اس دفتر کے شروع ہونے کا وقت 8 بجے ہے' تو اس ملازم پر فرض ہے کہ وہ اپنے دفتر 8 بجے پہنچ جائے اگر وہ دیر سے دفتر پہنچتا ہے' تو وہ اللہ رسول کی معصیت و نافرمانی کرتا ہے اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے' دفتر دیر سے پہنچنے کی معصیت سے ڈر کر تاخیر سے ڈرنا تقویٰ ہے۔

(10) اگر ایک شخص لاہور سے کراچی جاتا ہے۔ مملکت کے احکامات کے مطابق وہ ریل کا ٹکٹ لیتا ہے۔ اس کا ریل کا ٹکٹ خریدنا عبادت خداوندی ہے۔ وہ ٹکٹ اس لئے لیتا ہے کہ ٹکٹ نہ لینے سے اسے مزید جرمانہ ادا کرنا ہوگا' جرمانہ کی رقم کی ادائیگی سے بچنا تقویٰ ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ یہ سب احکامات' عبادت' تقویٰ' یہ سب احکامات اسلامی نظام میں ہوں گے' غیر اسلامی نظام پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ غیر اسلامی مملکت کی اطاعت تو ایک طرف' اس میں تو زندگی گزارنا بھی حرام اور جرم ہے اگر فرض کریں کوئی شخص ہندوستان میں دوسروں کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہیں ہوتا تو یہ کوئی اطاعت خداوندی شمار نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی اس پر عمل کرنے سے تقویٰ حاصل ہوگا۔ وہ بلا اجازت دوسروں کے گھروں میں اس لئے داخل نہیں ہوتا کہ وہاں کے سول (Civil Law) کے مطابق اس کو پکڑ لیا جائے گا۔ غیر اسلامی حکومتوں میں نہ ان کی اطاعت عبادت ہوتی ہے۔ نہ ان کے احکامات کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچنا تقویٰ ہو سکتا ہے یہ تمام مثالیں جو اوپر تحریر کی گئی ہیں وہ سب اسلامی نظام کے حوالہ سے بیان کی گئی ہیں۔ مقصد ان کے پیش کرنے کا یہ واضح کرنا ہے کہ تقویٰ کوئی ذہنی یا فکری چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق صرف آخرت سے بھی نہیں۔ اس میں پرستش کا بھی کوئی دخل نہیں۔ یہ انفرادی طور پر حاصل بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مملکت کے احکامات کی نافرمانی کے غلط' اور تخریبی نتائج سے بچنے کا نام تقویٰ ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

☆.....☆.....☆

عارف کسانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

ہم مسلمان کیوں ہیں؟

پیارے بچو! آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ لندن براعظم یورپ کا سب سے بڑا شہر اور برطانیہ کا دارالحکومت ہے۔ یہاں دیکھنے کے لیے بہت سی جگہیں ہیں۔ بچوں کی پسند کی بہت ساری چیزیں ہیں۔ اِسی لندن شہر کے ایک علاقے میں ایک چھوٹی اور پیاری سی بچی علیشاہ اپنے امی، ابو اور دو بہنوں کے ساتھ رہتی ھے۔ تینوں بہنیں آپس میں بہت پیار سے رہتی ہیں۔ علیشاہ سب سے بڑی ہے اور وہ سکول جاتی ہے جبکہ اریبہ اور سب سے چھوٹی عنایہ گھر میں کھیلتی رہتی ہیں۔ اُن کے گھر کے پاس ہی بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا پارک ہے جہاں جھولے اور کھیلنے والی بہت سی دوسری چیزیں بھی ہیں۔ وہ تینوں اپنی امی اور ابو کے ساتھ وہاں جاتی ہیں اور خوب مزے سے کھیلتی ہیں۔

ایک دن اریبہ نے پوچھا امی جان ہم مسلمان کیوں ہیں؟

امی جان نے کہا کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے ہم مسلمان ہیں۔ اریبہ نے پھر پوچھا کہ مسلمان کون ہوتا ہے اور جو مسلمان نہیں ہوتے ان میں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ اُس کی امی جان نے بتایا کہ زمین، آسمان اور پوری دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے انسانوں کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے لیے قوانین اور طریقہ بنایا ہے جسے اسلام کہتے ہیں اب جو بھی انسان اُس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اُسے مسلمان یا مُسلم کہتے ہیں اور جو اُس کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے وہ قوانین قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اب علیشاہ نے پوچھا کہ امی جان قوانین کا کیا مطلب ہے۔

اب امی جان نے بتانا شروع کیا کہ قانون کی جمع کو قوانین کہتے ہیں۔ قانون کا مطلب ہوتا ہے آئین، اصول اور وہ ضابطے جن کی سب کو پابندی کرنا ہوتی ہے۔ کچھ دن پہلے ہمارے گھر کے نزدیک دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔ تمہیں معلوم ہے ناں۔ جی امی جان وہ جو سرخ اور نیلی گاڑیاں تھیں۔ علیشاہ نے جواب دیا۔

ہاں وہی سرخ اور نیلی گاڑیاں اور اللہ کا شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ حادثے کے بعد وہاں پولیس آ گئی تھی۔ پولیس نے سب کچھ دیکھ کر سرخ کار والے کو کہا کہ قصور تمہارا ہے اور اُس کو جرمانہ بھی کر دیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ پولیس نے یہ کیسے کہہ دیا کہ قصور سرخ گاڑی والے کا ہے۔ بات صاف تھی کہ سڑک پر چلنے کے لیے قانون موجود ہے اور سڑک کے جس طرف چلنے کی اجازت ہو اسی جانب گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ جو بھی اس کے مخالف گاڑی چلائے گا وہ قانون کی خلاف ورزی کرے گا۔ سرخ گاڑی والے نے قانون کے خلاف گاڑی چلا کر جُرم کیا جس کی اُسے سزا ملی جبکہ نیلی گاڑی والا قانون کے مطابق اپنے ہاتھ جا رہا تھا اسی لیے پولیس نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ قانون انسانوں نے بنایا ہے تاکہ سب اچھے طریقہ سے رہیں اور کسی کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ ہو۔

علیشاہ نے پھر پوچھا۔ امی جان کیا اللہ تعالیٰ نے بھی کوئی قانون بنائے ہیں ۔

امی جان۔ جی بیٹا اللہ نے بھی قانون بنائے ہیں جن کے خلاف چلنے سے انسان کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔

علیشاہ۔ امی جان اس کی بھی کوئی مثال بتا دیں۔

امی جان نے بتانا شروع کیا اور کہا کہ تمھیں معلوم ہے نا کہ تمہارے ماموں زاد بھائی ناصر نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ جس سے اُس کا ہاتھ بُری طرح جل گیا تھا۔ وہ شدید درد کی وجہ سے چیخ رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر تمہارے ماموں کہہ رہے تھے۔ اچھا ہوا! اب تمھیں سمجھ آئے گی۔ ہم تمہیں روز سمجھاتے تھے کہ آگ کے ساتھ نہیں کھیلا کرو لیکن تم بازی نہیں آتے تھے۔ اب تمہارا ہاتھ جل گیا ہے تو آئندہ کے لیے تمہیں نصیحت ہو جائے گی۔ یہ تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہے جس کی تمہیں سزا ملی ہے۔

کیا تمہیں معلوم ہوا کہ ناصر کو کس بات کی سزا ملی؟ اُسے قانون کے خلاف چلنے کی سزا ملی۔ آگ کی خاصیت ہے کہ جو بھی اس میں ہاتھ ڈالے گا اس کا ہاتھ جل جائے گا۔ اِس کو بھی قانون کہتے ہیں۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے۔ خدا نے اِس طرح کے بہت سے اور قوانین بھی بنائے ہیں جن کے خلاف چلنے سے انسانوں کو بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اِسی لیے ہمیں چاہیے کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی گزاریں۔ اِسی کو اسلام کہتے ہیں۔

ہم مسلمان ہیں اور جو بھی اللہ نے قرآن مجید میں کہا ہے اُس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ۔ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان خود بھی امن اور سلامتی سے رہتا ہے اور دوسرے بھی امن اور سکون سے رہتے ہیں۔ اسی لیے اسلام کے معنی اَمن اور سلامتی کے ہیں۔

علیشاہ نے کہا امی جان آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھے بہت اچھی باتیں بتائی ہیں جو میں اپنے دوستوں کو بھی بتاؤں گی۔

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 3

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is October 5, 1982 and our lecture starts with Surah Al-Najm (النجم) verse (53:1).

Summary of the last two lectures

My dear friends, I presented details of the tradition that is called Isra and Mi'raj. For the first part, verse (17:1) is presented in support of our Prophet's journey on Buraq from Masjid Al-Haram to Masjid Al-Aqsa. And Surah Al-Najm is presented in support of the second part of the event – going to the heavens and meeting Allah. We saw that the first part is against the facts; and the second part is against the concept of Allah as presented by the Quran, which says that Allah is there wherever you are; that He is closer to you than your jugular vein. So, one does not have to go to a particular place to meet Him.

Anyway, let's start Surah Al-Najm. In a nutshell this Surah explains the proper position of نبي (Nabi) and its high status. It provides the true place of Muhammad (PBUH) as the recipient of Allah's وحي (Wa'hi - Revelation). Although the entire Quran is unique in its style and presentation, but some Surahs reach the pinnacle in their loftiness and elegance. And Surah Al-Najm is on top of the list of such Surahs, in my opinion.

Human mind cannot comprehend the source of وحي (Wa'hi - Revelation)

My dear friends, although every word of the Quran is Quran; that every word of the Quran has within it deep meaning – but its source is beyond the material universe; that we cannot come up with a term for it, or even comprehend or imagine its source. This part of how the revelation originated and how it came down to the Prophet (PBUH) is beyond human grasp. But, nonetheless, its language and its meaning is connected with this world. So, we can very well imagine how deeply concentrated its meaning would be. This Surah reflects that characteristic. And its next part – which also consists of one or two words and is also deeply concentrated in its meaning – is to establish the divine system in the world based on this revelation. So, we can say that the first part which involves the receiving of the revelation is نبوت (*Nabuwwat*); and the second part, to establish a system of life in the human world based on the revelation, is the رسالت (*Risaalat*). Although every prophet received a book, but our Prophet (PBUH) was at the pinnacle of نبوت (*Nabuwwat*) because he was the

recipient of the final Book of Allah. That is why I titled my book on the biography of the Prophet (PBUH) as the "Pinnacle of Humanity." And that is why I titled a booklet, the "High Status of Muhammad (PBUH)" dealing with explanation of Surah Al-Najm. This Surah has the basic characteristics of both the نبوت (*Nabuwwat*) and the رسالت (*Risaalat*).

Quran provides fundamental attributes of true knowledge

A movement called "humanism" started in Europe but couldn't get very far. Its signs are still there though. The idea behind this movement was that humans need religion but that religion should not be based on revelation from God. Julian Huxley was a prominent figure in this movement and the title of his book is "Religion without Revelation." He claimed that he was in search of such a manmade religion, and he wanted that this should be presented in such a language which "would be simple enough to appeal to the generality of men, but at the same time deep and rich enough to satisfy the most complex mind" (NY Times, 8.22.1952). The Quran has both these qualities. There were very few among Arabs who could read and write 1400 years ago. They were the most backward people in the world at the time. These were the first addressees of the Quran. To present the realities of the Quran so that even they could understand, was a challenging and difficult task. The Quran is a guidance for humanity until eternity. So, no matter how far human knowledge advances, the Quran will continue to lead that knowledge, and will continue to guide humankind. So, think about it my friends: how unique, unparalleled, and all-encompassing attributes this Book should have! This is the style of the Quran. Now, look how the Quran explains these nomadic desert Bedouins that this Book will serve them as their guidance – that it will not change; that it will not deceive; that it will not desert them in the middle of the way.

Arabs generally travelled in the night because of the extreme desert heat in the day. There were no roads nor lights nor landmarks nor towns in the desert. Oases were few and far between where nomadic Bedouins used to stay for few days and move on to the next one. Imagine it is dark night. Sand dunes in deserts will be here today and gone tomorrow. So, they cannot serve as landmarks. Bushes could not serve as landmarks because the desert storms would cover them with sands. These were the conditions under which these Bedouins used to travel in the night. So, they were asked: what provided you guidance to travel in the night under these harsh and uncertain conditions? The answer: Stars. Did the stars deceive you ever? No. Did any star which was at one place one night and suddenly disappeared the other night? No. So, these heavenly stars provide you complete and permanent guidance in your journey at night and do not deceive you? Yes, that is the case. Then, don't you think you also need heavenly, complete, and permanent guidance that will guide you in your life's journey as well? This is a perfect and clear cut way to explain to these illiterate Bedouin Arabs about the divine guidance that will guide them in their life

journey as well – that will never deceive them; nor disappear nor change.

So, this is what the first verse of Surah Al-Najm says: وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ;مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (53:1-2) – These people wonder about to what extent Allah's وحی (Wa'hi - Revelation), which claims to guide them, is dependable? They are afraid that at some time it may either mislead them or leave them in the lurch. Ask them: where did they get their guidance from, when they travel at night in the desert, where they do not have any fixed sign or clear path to guide them. There you determine your course after seeing the position of stars. So what does this experience tell you? Is that guidance not dependable? Do the stars deceive you by changing their positions? Do they not always provide you the same guidance? Have they ever left you confused? So whatever opinion you have with regard to the stars, it should be exactly the same in respect of Allah's وحی (Wa'hi -Revelation). The Messenger gets the وحی (Wa'hi - Revelation) from the same source from where stars get their guidance to travel on a set course (6:98; 56:75). Therefore, the star which appears at a fixed point and which travels across a set course and sets at a particular point (always following the same course and pattern), is a witness to the fact that, your companion (who has been commanded to guide you on the right path of life) is neither wandering in search of the right course, nor has he gone astray after finding it. He knows his destination and the way that leads to it.

As we have mentioned many times before the letter و is used in Arabic for evidence, and Najm means star. The word هَوَىٰ is a very comprehensive word. It includes in its meaning all its three phases: its rise at a certain place; its complete path that it travels through; and then a fixed place that it sets.

Quran's introduction of the Prophet (PBUH)

Arabs were extremely proud of their poetry and their language. They used to call others 'Ajam (dumb). But they were awe-struck by the presentation and the style of the Quran. They didn't know what to call it – poetry, prose, or something else. The verse (53:1) has just two words. The word هَوَىٰ captures the rise, the entire movement, and the setting of star. And the Quran introduces the Prophet (PBUH) to them as their صاحب (Sahib), as their companion and friend – not their Imam or leader. The Quran tells them: the Prophet (PBUH) to you is like the members of your caravan. غَوَىٰ means one who has lost one's way; and ضَلَّ means one who is trying to find one's way. So, the Quran is saying that your companion has not lost his way. He knows his way and his destination, just as the star does. Both get their guidance from the same source. The person who receives revelation clearly knows his way because it is not the result of his own effort and thoughts. If one has to find one's own way, then one goes through a trail-and-error process. But a messenger receives revelation from Allah. There is no trace in it of his own thoughts. What the messenger conveys to you is purely objective truth that comes from the Almighty creator of the Universe, Allah. So, the Quran proclaims: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) – Whatever he tells you in his

capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. The Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messenger have no share in it. Human emotions and opinions are a result of personality and reflect a person's exposure in society. However, the وحی (Wa'hi - Revelation) that one gets from outside source is objective truth. It is permanent, unchangeable, and impervious to human emotions and thoughts.

Human intellect makes decision based on the material and data it has at certain time. After a while when data or material change, it makes a different decision. In fact, human thoughts keep changing all the time. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:4) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the وحی (Wa'hi - Revelation) revealed to him from the Almighty. Quran contains Divine revelation and the feelings or personal opinion of the Messenger have no share in it.

The Quran says that وحی (Wa'hi - Revelation) was sent to stars, to heavens and earth, to honeybee. So, the وحی (Wa'hi - Revelation) sent to the Messenger will definitely guide you to the final divine goal as promised. The Messenger will practically implement the divine plan and the results will provide the proof. So: قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (6:135) – O Messenger, tell your people: "You may do whatever you choose; I will not interfere. On the other hand, do not interfere in My program. The results will soon show to whom success will eventually belong. Allah's law is that tyrants can never prosper."

This is the pragmatic test for any program: you work on your program and I will work on my program. The result will show who is beneficial to humanity. End of the matter! But this is not the case in the world of religion. Just keep following what you are told by the religious leaders. When people ask them why the promised results are not showing up, people are told that results will come in the hereafter. That is, take the medicine here but you will get better after you die! However, this is Deen which provide pragmatic test *here* in *this* world. It says to its opponents to provide proof: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (2:111) – Provide the proof if you are truthful.

My dear friends, this is distinctive characteristic of Deen compared to religion. This is how the Quran explained the divine guidance to the illiterate Bedouins by pragmatic example of stars who used them for their guidance for traveling in the desert at night. Now, let us see how the Quran could also provide guidance to scientist and intellectuals. The Quran says that all things in the Universe are tightly interconnected and are subject to the Laws of Nature; and that humans have been given the power to conquer the forces of nature and make use of them. Objects in the Universe are so tightly interconnected with each other that James Jean says that if I move my figure then it has effect on stars inside the galaxies. So, on one side, the

illiterate desert Bedouins were able to understand and, on the side, scientists like James Jean is also able to understand from the same statement that the Quran presents. This is the reason Maurice Buccaille was in awe when explaining such verses of the Quran related to Nature and asked all the scientists of the world to ponder on this fact: that how could a human being tell these things 1400 years ago when modern science has been able to discover only now! So, the author of the Book, the Quran, must be the author of the book of Universe.

My dear friends, the claims of the Quran are not based on creed. We, Muslims, have not done our job to understand the Quran from this point of view, what to say of providing irrefutable evidence of Quran's claim to the world. Therefore, from the stars the Quran provides practical evidence of its message to Bedouins as well as to top scientists. So, what the Messenger presents to you is not the product of his own thoughts. It is Allah's revelation: إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (53:4). I presented many verses in previous lectures about this. There is no need to repeat here. Here are some references regarding how stars guide you (6:97, 56:75, 81:15). Next the Quran says regarding the revelation that the Prophet (PBUH) receives: عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ (53:5) – He gets it from One, Who is Universally Mighty and Powerful. You can visualize His Power and might from the countless stars and galaxies that are traveling in their determined paths, bound by His Laws. Similarly, the laws that have been revealed to humankind through this وحی (Wa'hi - Revelation) are bound to produce their results, without any deviation.

The fundamental differences in thinking and in program between Deen and religion

My dear friends, please ponder what a great reality the Quran has described in (53:5). Sermons exhorting morality and ethics have continued in the world. Every religion preaches these things. Deen does not preach and sermonize. Deen establishes its system in the world. It confronts the forces of falsehood head on. It fights and overpowers them. Therefore, to establish Deen power is needed. This was the fight between religion and Deen that we went through during Pakistan movement. Proponents of religion were saying that there is no need to have a separate country for Islam; that we are free to practice Islam by remaining in India. So, why demand a separate country? Yes, ok, for religion there is no need to have a separate state. But to establish Deen requires not only a separate state but also power to maintain control of the state. After receiving the teaching (عَلَّمَهُ) of revelation, strong power (شَدِيدُ الْقُوَىٰ) is required to establish it. As Allama Iqbal says: If there is no power, then divine rule cannot be established – the work of Moses becomes worthless.

System of sustenance must adapt to changing conditions

Nothing remains the same forever. Everything in nature changes continuously. Bedouin Arabs didn't travel the same path always. They travelled to different destinations depending on changing conditions. The condition and requirements of

humankind keeps changing all the time at the individual level as well as at the collective level. A child's nutritional requirement keeps changing from the moment he is born. Nourishment progressively adapts as the fetus develops inside the mother's womb. After birth the mother's milk automatically adjusts to nutritional requirement of the baby as he grows. This is the system of divine sustenance. This attribute of Allah is called Rahim – One who provides nourishment that adapts progressively according to changing conditions.

Character attributes required to implement Allah's system of sustenance

My dear friends, if you look at the entire life of an individual from birth to death then you will notice that requirement for his physical, mental, and psychological sustenance and development keep changing throughout his life. An individual's life goes through many phases through this life. Allah does not give this sustenance all at once. He does not say that take this sustenance, which is for your entire life. If He has all the power and authority, if he is شَدِيدُ الْقُوَىٰ then He has also the control over different phases humans go through throughout life: ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ (53:6) – Not only does the Almighty possess unlimited powers, but He is also aware of the various ups and downs of life. He is therefore capable of providing comprehensive guidance that covers all aspects of one's individual and collective life. It is obvious that the person, the Messenger, who has to receive وحی (Wa'hi - Revelation) should be an embodiment of virtue and wisdom. Hence the Messenger's personality developed with complete poise and his character attained perfect purity to accomplish the task of establishing the universal system of sustenance.

As I mentioned, there is a world of meaning in every word of the Quran. One who has only power knows only power. But. along with having power and authority, He also has the responsibility of providing sustenance. So, He must also know and have full control over the requirement of providing sustenance in every phase and every period of life. This is the case with the One who provides the وحی (Wa'hi - Revelation). Then comes the responsibility of the recipient of the وحی (Wa'hi - Revelation), the Prophet (PBUH). After receiving the revelation, he must have the power to establish the universal divine system of sustenance; and to practically provide and carry out that responsibility of messenger-hood through all the phases of life of the community.

The messenger serves as a perfect role model in the human world

This heavy responsibility rests now on the shoulders of the Messenger (PBUH) to implement this universal system of sustenance. What kind of attributes he should possess to fulfil this responsibility? There should be power; there should be knowledge; there should be sustenance; there should bè progress and development. The Messenger should be aware of the different phases and consequent requirements of life of the community. He should have physical power and authority (*Aziz*); as wells as the control over progress and development and sustenance (*Rahim*).

These are the two attributes that the messenger should possess in his character to establish and to run the divine system of universal sustenance in the human world. There should be optimal balance between these opposite attributes in the messenger's character in order to take the human society on the path of holistic progress and human development. Otherwise, there will be chaos in the society. If the power dominates in his personality, then he will become Genghis. If there is no power or it shrinks, then he will become preacher and won't be able to establish the system of Deen. It is essential therefore that these two opposite attributes be in proper proportion in his personality.

Psychology in the modern age

This is called "balanced personality" in terms of modern psychology. What is called psychological disease is really an imbalance of personality attributes. Fourteen hundred years ago the Quran called it: فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ (2:10) – they have disease of the mind. And the Quran provides cure for it: شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (10:57). Allah Akbar!

My dear friends, nobody could understand these terms what the Quran has mentioned those days. What are these diseases of the mind? Modern psychologists have coined different terms for these diseases. One of the terms they have coined is called "psyche." This is different from what the Quran calls the diseases of the قُلُوبِ. I don't have time to delve into details now. But let me tell you that in a nutshell these diseases arise in the subconscious mind. Unfulfilled desires, crushed wishes, weight of uncommitted sins are hidden in the subconscious mind; and these prick the subconscious mind like a thorn. Psychologists and psychiatrists say that when the balance of different abilities gets disturbed in the mind then it expresses itself as a disease. The cure they prescribe is to restore the balance. So, healthy mind is the one which is able to achieve balance within all the contradictory abilities and powers within the mind.

The Prophet (PBUH) was at the top of the perfect balanced personality

My dear friends, the definition of beauty is having perfect proportion. In an otherwise perfectly beautiful face if there is a minor flaw in one eye compared to the other eye then its entire beauty is ruined. Similarly, if there is minor flaw – e.g., being hot-tempered – in an otherwise balanced personality, the that personality becomes unbalanced and therefore sick. The Prophet (PBUH) was at the pinnacle, having the perfect balanced personality. The Quran says about the Prophet (PBUH): ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ (53:6) – The Messenger is the perfect embodiment of virtue and wisdom. He has the most balanced personality with complete poise and with perfect purity of character required to accomplish the task of establishing the universal system of sustenance.

The world is awe-struck by how the Prophet (PBUH) created the unique and the greatest revolution the world has seen. This is called فَاسْتَوَىٰ (53:6). The word اسْتَوَىٰ (Istawa) means to have perfect balance. Without balance one cannot stand firmly;

without balance a nation cannot move forward because it cannot stand firmly on its feet. If one of the feet of a chair is missing, then one will fall if one sits on it.

My dear friends, the model is: Achieving balance in multitude of contradictory potentials that Allah has given humans and taking it to the pinnacle of perfection is اسْتَوٰى (Istawa). The Prophet's (PBUH) perfect balanced personality that reached the highest pinnacle of character is summed by the Quran in this one word – فَاسْتَوٰى (53:6) and is the best role model for humanity.

The world of Sufism

My dear friends, time is running out fast. The question is: if one has achieved the balanced personality; one has achieved proper proportion in one's abilities; one has all the qualities – but after all this accomplishment if one is sitting aloof cut off from humanity's issues then what is the use. In the words of Ghalib: If one does not cure my pain and suffering then one may be the son of Mary, so what? My dear friends, this is the difference between Sufism and messenger-hood. I have gone through the valleys of Sufism. The more the Sufis go higher and higher in this valley the more and more they shrink away from the world. They remain more and more absorbed in their own virtual world by renouncing the real world.

My dear friends, what is the use of reaching these heights if one remains detached from this world. The نبی (*Nabi*), in fact, reaches such a pinnacle of height that he receives revelation from Allah. And the Sufi also claims to receive what he calls کشف "*Kashf*" and الہام "*Ilham*." The نبی (*Nabi*) reaches the place of unitary experience, which is at the pinnacle of divine knowledge and divine revelation. The divine knowledge directly enters the breast of the نبی (*Nabi*). This is pure, objective, and definite knowledge that the نبی (*Nabi*) receives from Allah. If he also goes into solitude and remains absorbed in his own virtual world like the Sufi does – then what is the use of that knowledge to the humankind facing challenges and problems of the real world. A نبی (*Nabi*) descends from this pinnacle of height and returns to the real world. Please listen to just two words my friends, and remain ecstatic until the next lecture. The Quran says that after reaching such a height he returns to the level of this world. Did your mind find any metaphor to describe this situation? Well, it is impossible to come up with a perfect metaphor to describe this whole scenario. You know that the place where the sky and the earth seem to meet is called the افق (*Ufaq*) or horizon. This is the perfect metaphor to explain that the heavenly divine revelation which the نبی (*Nabi*) receives from Allah, he then brings it down to the earthly level: وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ (53:7) – When he received the وحی (Wa'hi – Revelation) he reached the pinnacle of knowledge (that is beyond human intellect or wisdom) and returned to human level. Hali has put it in a beautiful way:

After returning from Hira he came to the people;
And brought a prescription of humanity's ailment!

Think about it my friends! I have been thinking in the Quran for a long time. I have been explaining and writing about its teaching for quite some time. But I could not come up with such a perfect metaphor to explain this concept in a such beautiful perceptible way that a نبی (*Nabi*) after reaching the pinnacle of divine knowledge, he returns to tackle the problems of the human world.

Allama Iqbal explains the difference in position of Sufi and نبی (*Nabi*)

Allama has explained the difference in the experience of Sufi and the نبی (*Nabi*) in his book entitled, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam." It is a difficult book to read but I advise you to read if Allah has given you the abilities. He quotes the famous saying of a Sufi (Abdul Quddus Gangohi) in this book. Iqbal writes:

"Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned." These are the words of a great Muslim saint, 'Abd al-Quddūs of Gangoh. In the whole range of Sufi literature it will be probably difficult to find words which, in a single sentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and the mystic types of consciousness. The mystic does not wish to return from the repose of `unitary experience'; and even when he does return, as he must, his return does not mean much for mankind at large. The prophet's return is creative. He returns to insert himself into the sweep of time with a view to control the forces of history, and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of `unitary experience' is something final; for the prophet it is the awakening, within him, of world-shaking psychological forces, calculated to completely transform the human world. The desire to see his religious experience transformed into a living world-force is supreme in the prophet. Thus his return amounts to a kind of pragmatic test of the value of his religious experience. In its creative act the prophet's will judges both itself and the world of concrete fact in which it endeavours to objectify itself. In penetrating the impervious material before him the prophet discovers himself for himself, and unveils himself to the eye of history."

This, my dear friends, is the return of a نبی (*Nabi*) after getting the divine revelation from the highest source– he returns to the human world, i.e., to the earth, which he then shapes it step by step and turns into heaven. This is how the divine program is carried out. As the Quran says: يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (32:5) – His way of creation is that when, according to His Mashiyyat, He plans a scheme, He initiates it from the lowest level and then (with the cooperation or assistance of various physical elements; and by passing through various stages of an evolutionary process) it slowly and steadily develops to its destination as established by Allah (35:10).

The teaching of revelation: pinnacle of both knowledge and wisdom

The descending from the heaven to the earth is a term the Quran uses for the the وحی (Wa'hi – Revelation). The reality reveals itself and the Quran uses the term نزول (meaning coming down from above) for وحی (revelation). The fundamental attribute

of وحي (Wa'hi – Revelation) is its objectivity. So, he was above the horizon: وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى? (53:7) – When he received the وحي (Wa'hi – Revelation). Now the Quran says: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى? (53:8) – He thus came very close to the absolute realities of the universe and deeply understood the Divine Laws, becoming in unison with them. He returns to face the human issues and delves deep into the heart of humankind's problems. My dear friends, there is big difference in being close to someone and in descending into someone's heart. Joad has written that if a philosopher who has cosmic knowledge and dives deep into human emotion then he is a creative genius. He says both these things are essential for a creative genius. Creative genius creates a new world. The نبي (*Nabi*) after receiving the وحي (Wa'hi – Revelation) creates a new world.

My dear friends, a book can be written for each of the words of these two verses: وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ; ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى? (53:7-8). So, the نبي (*Nabi*) after receiving the objective knowledge descends and delves into human issues. But this is not enough. The next verse says: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى? (53:9).

I will explain قَابَ قَوْسَيْنِ in the next lecture. Our traditional explanation is the same old same old story based on material space and time: that Allah and the Prophet (PBUH) were facing each other and were getting closer and closer until the distance between them reached the length of two crossbows. Please don't laugh but cry! The entire story of Isra was Mi'raj is based on physical descriptions. It says Allah was physically sitting on His throne. The Prophet (PBUH) physically went there. They physically got closer to each other and they physically talked to each other. All the traditional sermons and hymns highlight these physical stories. I will discuss all these things in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

IMPORTANT NOTICE

Dear Friends, Since the spread of COVID-19 and country wide lockdowns from March 2020, the continuity of our sequenced weekly (every Sunday) Dars-e-Quran presented in form of Video Lectures by Baba Ji (G.A. Parwez) at our Bazm-Tolu-e-Islam (DHA) Karachi, has been disturbed. Given the conditions and prevailing situations at hand, it seems that we will still not be able to continue our weekly Dars-e-Quran at our premises, keeping the safety and health issues of our members and visitors in mind.

Therefore, we have decided to start our weekly Dars-e-Quran Online, which will be simultaneously aired live on Facebook & YouTube as well. Indeed, every obstacle comes with a new opportunity!

Given below are the web addresses of our Facebook Page & Youtube Channel: FaceBook Page: https://www.facebook.com/bazmetolueislamkhi/

YouTube Channel: https://www.youtube.com/deenequran

We request you all to Like, Follow, & Subscribe to both of our Channels to continue watching LIVE Dars-e-Quran by Baba Ji at your home, with convenience and comfort.

Humble Regards,

Representative Bazm Tolu-e-Islam (DHA) Karachi.

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کرسکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان وکائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)